المنار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ

(قرآن کریم سورہ اعراف)

المنار

تعلیم الاسلام کالج۔ ربوہ

نگران

شیخ محبوب عالم خالد ایم۔ اے

ادارۂ تحریر

لطف الرحمٰن محمود

مہر اللہ یار

سلیم اختر صدیقی

جلد ۸ — مارچ، اپریل ۱۹۵۹ء — شمارہ ۵، ۶

حُسنِ ترتیب

مستقل کالم:۔

بر سبیل تذکرہ .. .. مدیر
نقد و نظر .. .. سیلانی
پہچانئے تو؟ .. .. لطف الرحمٰن محمود

تبرکات :۔

لَاشَکَّ اَنَّ مُحَمَّدًا خَیْرُ الْوَرٰی .. .. حضرت بانیٔ جماعتِ احمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

مقالات و مضامین:۔

تصوف کیا ہے؟ .. .. قریشی ضیاء الحق
ثقافتِ اسلامیہ؟ .. .. سلیم اختر صدیقی
مرزا فرحت اللہ بیگ کا اسلوب بیان .. .. .. مہر اللہ یار
پنجابی زبان کا ایک قادر الکلام شاعر .. .. منظور احمد شاکر

نظمیں و غزلیں:۔

عبدالسلام اختر ایم۔اے
سمیع اللہ ایم۔اے
محمد ہادی مونس
لطف الرحمٰن محمود
منظور احمد شاکر
محمد اکرام خان

افسانوی ادب:۔

سیاہ حلقے .. .. اختر وہاب طلعت

متفرقات :۔

.. ..

پرنٹر پبلشر: جمشید ہاشمی + مطبع: ضیاء الاسلام ربوہ

برسبیلِ تذکرہ

● جس طرح موسمِ خزاں کے بے رحم تھپیڑوں سے کسی لالہ زار کے دامن میں رعنائی کے جھلکتے ہوئے پھول کمہلا جاتے ہیں اسی طرح موسم امتحان کے افسردہ دَور میں خشک اضطراب کی سرد لہروں سے کالج کے جریدہ کی رگوں میں ادبی زندگی کا کھولتا ہوا مصفا خون ٹھٹھر جاتا ہے ——— فروری کے شمارہ کے بعد "المنار" کو بھی تقریباً اسی قسم کے بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر نامساعد حالات کے باوجود ہم تازہ شمارہ پیش کرنے کی جرأت کر رہے ہیں۔ اگر آپ کی نگاہِ ملاطفت نے پسند کیا تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری حقیر کوششیں رائیگاں نہیں گئیں!

● "تصوف کیا ہے؟" کے عنوان سے ایک مختصر مگر جامع تحقیقی مقالہ شریکِ اشاعت ہے۔ موجودہ نظامِ تعلیم کے ہاتھوں مجبور طالب علم کے لئے ایک محدود وقت میں تینوں اجزاء کو یکجا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ المنار مسرت کے ساتھ ——— ضیاء الحق قریشی سے پہلی مرتبہ قارئین کو متعارف کرا رہا ہے ع

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

● شاکر صاحب اِس مرتبہ "پنجابی زبان کے ایک قادر الکلام شاعر" کا تعارف کرا رہے ہیں۔ آپ نے اِس موضوع پر قلم اٹھا کر المنار کی اُس خامی کا تدارک کیا ہے جسے علاقائی ادب کی نمائندگی کے سلسلہ میں عرصۂ دراز سے محسوس کیا جا رہا تھا!

● استاد اور شاگرد جس پاکیزہ رشتے میں منسلک ہیں اس کی تقدیس اور عظمت سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ مگر دن بدن نئی روشنی کی برقِ بے زمام ان مقدس اقدار کی نازک کونپلوں کو بھسم کر رہی ہے۔ طلبہ کو اساتذہ سے اور قریب کر کے اُن کے دلوں میں اپنے محبوب کرمفرماؤں کے لئے محبت و عقیدت کے جذبات کے پاک شعلوں کو فروزاں کرنے کے لئے ایک نئے کالم "پہچانئے تو؟" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اِس کالم میں شفیق اساتذہ کی پُرکشش شخصیات کی عقیدت مندانہ انداز سے نقاب کشائی کی جائے گی۔

ہمیں اُمید ہے کہ اِس نیک مقصد کی افادیت سے آگاہ طلبہ ہماری معاونت بہم پہنچائیں گے ——— (مدیر)

"سیلانی"

نقد و نظر

سالانہ مباحثے سالانہ مباحثوں کے دن بھی خوب ہوتے ہیں۔ ان دنوں عہدیدار حضرات طالبعلموں سے اُس منت و سماجت کا انتقام لیتے ہیں جو انہیں الیکشن کے وقت کرنا پڑتی ہے۔ ان حضرات کو شدید مصروفیت کا کچھ اس قسم کا دورہ پڑتا ہے کہ دماغ فلک سے پرے حدود لامکاں میں جا اٹکتا ہے ؎

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر

سیلانی بھی ازراہِ تفنن مباحثے سے کچھ دیر پہلے ایک عدد "ویزا" "مانگ بیٹھا" "آ بیل مجھے مار" والی بات ہوئی۔ پہلے تو ان حضرت نے سیلانی کا سرتاپا جائزہ لیا پھر غصے سے بولے —— پہلے کیا سوئے ہوئے تھے۔ اسسٹنٹ سیکرٹری کے پاس جائیے۔ دیکھیئے میں کتنا مصروف ہوں ——"

اسسٹنٹ سیکرٹری صاحب بڑی نرم طبیعت کے مالک ہیں۔ انہوں نے بڑی سادگی سے حاتم کی قبر پر لات ماری تھی مگر لات کی لات سے قبر کا کچھ نہ بگڑا۔ کیونکہ ان کے جاری کردہ تمام ٹکٹ منسوخ کر دیئے گئے تھے اسلئے سیلانی ان کے پاس تو نہ گیا بلکہ جھاڑ کھانے کے بعد زیر لب مسکراتا ہوا سیدھا ہال میں داخل ہوا۔ ہال کے سجانے میں واقعی بڑا سلیقہ برتا گیا تھا۔ دونوں اطراف ڈائس پر بڑے بڑے روشن بلب تھے تاکہ تقریر کے ساتھ ساتھ مقرر کے "خدوخال" سے بھی اچھی طرح واقفیت ہوتی جائے۔ صاحب صدر کے کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد قائد ایوان جناب ابوبکر نے انگریزی مباحثے کا آغاز کیا۔ قائد حزب اختلاف جناب اجمل غوری تھے۔ تقریروں کو تو آپ نے شاید سیلانی کی نسبت زیادہ غور اور توجہ سے سُنا ہوگا۔ مباحثے کا معیار گزشتہ سالوں کی نسبت بہتر رہا۔ کل بارہ کالجوں کے چوبیس مقررین نے حصّہ لیا۔ ٹرافی لاء کالج کے حصّہ میں آئی۔ دوسری رات اُردو کا مباحثہ ہوا۔ یہ انگریزی مباحثہ سے بھی زیادہ کامیاب تھا۔ سیلانی کا خیال ہے کہ اِس ہال کی اسٹیج پر اتنے زیادہ مقرر کسی ایک مباحثے میں کبھی نہیں بولے۔ یوں تو بولنے والوں کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی مگر تقاریر کا معیار گزشتہ سال کی نسبت پست تھا۔ سیلانی گزشتہ چند سال سے محسوس کر رہا ہے کہ رفتہ رفتہ مباحثوں میں تقاریر کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ ٹرافی ایس۔ای کالج بہاولپور کے حصّہ میں آئی۔

اللہ قسم! ناانصافی ہوگی اگر سیلانی "مددگار کارکنوں" کا ذکر خیر نہ کرے۔ جس طرح سطح ارض پر اندرونی اور بیرونی کارکن تبدیلیاں لاتے ہیں اسی طرح ہال میں تغیر و تبدل کرنے کرانے والوں کو "مددگار کارکن" کہا جاتا ہے۔ یہ حضرات جن کا "عہدِ حکومت" صرف چھ سات گھنٹے ہوتا ہے، ایک آدھ استثنا مصیبت ہوتے ہیں مگر ان کا وجود نہ ہو تو ہال میں اتنا شور و شر اُٹھے کہ چھت اُوپر بھی اُڑ جائے۔ مگر کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہال میں جتنا شور و غوغا ہوتا ہے اُس میں پچاس فیصدی ان بزرگوں کا بھی حصّہ ہوتا ہے۔ بلکہ خاموش کرانے والوں کا شر زیادہ ہوتا ہے! اردو زبان کے خلاف اُردو زبان میں ہی تقریر کرنے والوں پر خوب لے دے ہوتی رہی ہے مگر شور کو روکنے کے لئے شور کرنے والوں سے کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ حضرات کچھ سختیاں کر کے ببول کے پیڑ بھی بوتے ہیں۔ مباحثوں کے اختتام کے ساتھ ہی ان کے بخت اُڑ جاتے ہیں اگر آپ میں کسی "مردِ مجاہد" کا دل گردہ اتنا ہے کہ وہ دو تین سال فیل ہو سکے —— تو پھر سمجھنا چاہیئے کہ اس کے بھی "مددگار کارکن" بننے کے امکانات روشن ہیں!

ادبی نشستیں صحافت کے سالک راہ حضرت مولانا سالک

ایک مرتبہ کالج کے کسی مشاعرے کی صدارت کے لئے تشریف لائے۔ یہاں کی ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ کرکے فرمانے لگے ؎

"تڑپ رہے مُرغِ قبلہ نما آشیانے میں"

اربابِ بست وکشاد پر کچھ ایسا اثر ہوا ہے کہ اب روایت کو برقرار رکھنے کے لئے پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ جنابِ خالد اس معاملے میں پیش پیش ہیں۔ ملک کے بلند پایہ شاعروں اور مایہ ناز ادیبوں کو بلاتے رہتے ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ کا آدھ بھی اسی رنگ میں رنگین ہوتا جا رہا ہے۔ یوں تو ادبی جلسوں کا انعقاد ہوتا ہی رہتا ہے مگر سیلانی صرف ایک دو کا تذکرہ کرتا ہے ـــــ

ایک ادبی نشست کے روحِ رواں مولانا صلاح الدین احمد تھے اور دوسرے جلسے کا باعث لاہور کے متعدد شعراء اور ادباء کی تشریف آوری تھی۔ ادبی دنیا کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد سے کون واقف نہیں۔ آپ کے ہمراہ ڈاکٹر وزیر آغا بھی تشریف لائے۔ اسٹیج پر مسندِ صدارت پیش کی گئی لیکن آپ نے ساتھ والی کرسی کو ہی ترجیح دی۔ جنابِ خالد نے مولانا صاحب کا کچھ اس تیکھے انداز سے تعارف کرایا کہ سیلانی تو سیلانی ہی ہے صوفی صاحب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مولانا جناب آزاد کی نثری کیفیات پر روشنی ڈالنے کے لئے جب اُٹھے تو معلوم ہوا کہ عینک اپنی بھی لاہور ہی میں چھوڑ آئے ہیں۔ عقیدتمندوں نے عینکیں پیش کیں لیکن آپ نے برقی روشنی کو ہی کافی سمجھا۔ سیلانی کی کیا مجال کہ اس بصیرت افروز مقالے پر تبصرہ کرے لیکن مقالے کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سیلانی ایسے بدذوق بھی آخر تک مقالے کو بڑی دلچسپی سے سُنتے رہے۔

جس اجتماع میں مولانا تنویر موجود ہوں وہاں ضرور شاعری کا دَور گرم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حسبِ معمول مولانا سے کلام سنانے کی فرمائش کی گئی۔ مولانا کی "سنت" ہے کہ حفظِ ماتقدم کے طور پر پوری طرح لیس ہو کر آتے ہیں۔ چنانچہ مقالے کے بعد سامعین کو مولانا تنویر کی پھڑکتی ہوئی غزل سُننے کا بھی شرف حاصل ہوا۔

دوسری نشست کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے ادا کئے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی چوٹی کے نقادوں کی صفِ اوّل میں شامل ہیں۔ آپ نے "اُردو کے ادبی رسائل" کے موضوع پر تقریر کی جس میں سر سید مرحوم کے زمانہ سے لیکر موجودہ زمانے تک کے ادبی رسائل کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ آپ نے اس افسوسناک حقیقت کا بڑے رنج و الم سے اعتراف کیا کہ چند سال سے وہ شاندار ماحول ختم ہو رہا ہے۔ آپ کے نزدیک لوگوں کے ذوق کی پستی، ـــــ نظامِ تعلیم کی خرابی، ـــــ ذہنی تن آسانی، ـــــ اور نمود و نمائش کے رجحانات کی افزائش وغیرہ نے مل کر اس عدیم النظیر ادبی ماحول کو تنزل و انحطاط کے گڑھے میں دھکیلا ہے۔ مگر آپ اس دَورِ زبوں سے مایوس نہیں۔ آپ کو یقین ہے کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ اس جمود کا طلسم ٹوٹ جائے گا کیونکہ ؎

تیرہ شبی دلیلِ نمودِ سحر بھی ہے

جناب حبیب اشعر، مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم کے نواسے ہیں۔ آتی دفعہ تو بیمار ہو گئے تھے مگر جاتی دفعہ اہلِ ربوہ کی دُعا سے اچھے ہو گئے۔ ناسازیٔ طبع آڑے آئی ورنہ پروگرام کے مطابق انہیں بھی اپنا افسانہ سُنانا تھا۔ "بھاگتے ادیب کی غزل ہی سہی" ـــــ اسی خیال کے تحت ان کی ایک کیفِ آور غزل بطور تبرک ریکارڈ کر لی گئی ہے۔

احسان دانش صاحب پاکستان کے مشہور شعراء میں سے ہیں۔ ایک دفعہ پہلے بھی ربوہ آئے تھے اور متاثر ہو کر ایک نظم بھی تحریر فرمائی تھی۔ قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ آتی اور جاتی دفعہ اسی نظم کے اشعار گنگنا رہے تھے۔ آپ نے بھی اپنا بلند پایہ کلام سُنا کر حاضرین کو محظوظ فرمایا (سیلانی کو پتہ چلا ہے کہ عہدِ شباب (۱۹۳۴ء) میں جو رنگ آپ کا

گورنمنٹ کالج کے مشاعروں میں احباب نے دیکھا ہے وہ اب نہیں رہا۔ وہ ترنم اور آواز کی کشش اب باقی نہیں۔ ع
جوانی جا چکی لیکن غزل خوانی نہیں جاتی

جس نے "نقوش" کا سُنا ہے وہ ضرور طفیل صاحب سے واقف ہو گا۔ یہی طفیل صاحب ریوہ آئے تھے۔ آپ نے اپنا اُردو کلام اس تیکھے انداز سے سُنایا کہ سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مگر خالد صاحب "چند کلیوں پر قناعت" کرنے والے نہیں۔ چنانچہ "علاجِ تنگیٔ داماں" کے لئے طفیل صاحب کے ہندی دوہے ریکارڈ کر لئے گئے ہیں ـــــ طفیل صاحب نقوش کے دفتر میں بیٹھے ہوتے ہیں اور ادھر ہم "تنگی داماں" کا علاج کرتے رہتے ہیں !!

جناب عبدالسلام اختر نے بھی غزل سُنانے کی کوشش کی مگر عقیدت مندوں نے تحسین و آفرین کے ڈونگرے اتنے برسائے کہ کلام کانوں کی بجائے دل سے نکل کر سیدھا دل میں ہی جانے لگا۔ جناب اختر سے ایسے اظہارِ عقیدت کے عالم میں سیلانی خسارے میں رہتا ہے کیونکہ کوئی شعر پلے نہیں پڑتا ـــــ آئندہ آپ کے کلام کو ریکارڈ کر کے سُنانا زیادہ موزوں ہو گا !!

سائنس سوسائٹی

دونوں "خان" حضرات امسال پاکستان سائنس کانفرنس میں کالج کی نمائندگی کے لئے تشریف لے گئے۔ محترم نصیر احمد خان تو آتے ہی مباحثوں میں مصروف ہو گئے۔ مگر حبیب اللہ خان صاحب جب واپس لوٹے تو تیور بدلے ہوئے تھے۔ سیلانی سہم سا گیا کہ خیر ہی ہو کوئی راکٹ نہ اُڑا کر آئے ہوں۔ ہمت کر کے جب کانفرنس کے متعلق دریافت کیا تو بڑی مایوسی سے جواب دیا کہ ہمارے سائنسدان بیرونی سائنسدانوں کے سامنے اس طرح لگتے ہیں جیسے گریجویٹ کے سامنے طفل مکتب! ـــــ اس تمثیل کے بعد محنت کرنے اور سائنسدان بننے کی تلقین کی۔

اس سے پہلے بھی یہی شکوہ کرتے رہتے تھے کہ ہماری سائنس سوسائٹی کھاری کنوئیں کی طرح بے فیض ہے نہ حرکت نہ برکت ـــــ! چنانچہ عہدیداروں کے لئے "SLUGGISH MOLECULES" کی اصطلاح بھی وضع کی گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ کھوٹا پیسہ بھی کام آگیا ہے۔ سائنس سوسائٹی نے ایک جلسہ کر ڈالا ہے۔ پروفیسر مرزا منظور احمد صاحب نے پودوں کی جنسی کیفیات (Sex in Plants) پر تبصرہ کیا۔ پروفیسر صاحب ایک لمبی لاٹھی سے مسلح ہو کر تشریف لائے۔ اس سے پوائنٹر کا کام لیا گیا تاکہ سامعین خوفزدہ نہ ہو جائیں۔ اور سوال کرنے کی جرأت بھی کر سکیں۔ سلائیڈز وغیرہ کے لئے پردے لگے ہوئے تھے اندھیرا گھُپ تھا۔ سیلانی جب اندر داخل ہونے لگا تو اس کا پہلا احساس یہ تھا کہ حادثہ بلیک ہول کی تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ تو ہر طرف شاخیں، تنے، ٹہنیاں، کونپلیں اور پھول بکھرے پڑے تھے۔ لیکچر کچھ ایسا دلکش تھا کہ انگریزی سیکشن والے رشید صاحب سارا وقت محوِ خواب ہی رہے۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا جو قہقہوں میں ڈھل گیا!

یوں تو مُردے کی صفت یہ بیان کی گئی کہ وہ بولتا نہیں مگر جب بولنے پر آتا ہے کفن پھاڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہی مثال سائنس سوسائٹی پر صادق آتی ہے۔ چند دنوں کے بعد ایک اور جلسہ کر ڈالا۔ اس جلسے میں ڈاکٹر میر مشتاق احمد ہائیڈرالک آفیسر پاکستان اور ڈاکٹر الیاس ڈویاش نے تقریریں کیں۔ موضوعات کی تلخی کے کفارہ کے طور پر سلائیڈز اور تصاویر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جناب میر صاحب نے پانی کی قوت اور اس کے استعمال پر مبسوط تقریر فرمائی۔ ڈاکٹر ڈویاش صاحب نے کاغذ سازی کی صنعت کے بعض پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ یُوں تو یہاں ہونے والے ہر لیکچر کو بڑی دلچسپی کے ساتھ سُنا جاتا ہے مگر لیکچروں کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ مولانا ارجمند خان صاحب بھی بڑی دلجمعی سے انہیں سُن رہے تھے!

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

تبرّک

لَا شَكَّ اَنَّ مُحَمَّدًا خَيْرُ الْوَرٰى

(از حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام)

يَا عَيْنَ فَيْضِ اللّٰهِ وَالْعِرْفَانِ
يَسْعٰى اِلَيْكَ الْخَلْقُ كَالظَّمْاٰنِ
يَا بَحْرَ فَضْلِ الْمُنْعِمِ الْمَنَّانِ
تَهْوِيْ اِلَيْكَ الزُّمَرُ بِالْكِيْزَانِ
يَا مَنْ غَدَا فِيْ نُوْرِهٖ وَضِيَائِهٖ
كَالنَّيِّرَيْنِ وَ نَوَّرَ الْمَلَوَانِ
اَحْيَيْتَ اَمْوَاتَ الْقُرُوْنِ بِجَلْوَةٍ
مَاذَا يُمَاثِلُكَ بِهٰذَا الشَّانِ
وَجْهُ الْمُهَيْمِنِ ظَاهِرٌ فِيْ وَجْهِهٖ
وَشُئُوْنُهٗ لَمَعَتْ بِهٰذَا الشَّانِ
لَا شَكَّ اَنَّ مُحَمَّدًا خَيْرُ الْوَرٰى
رِيْقُ الْكِرَامِ وَنُخْبَةُ الْاَعْيَانِ
تَمَّتْ عَلَيْهِ صِفَاتُ كُلِّ مَزِيَّةٍ
خُتِمَتْ بِهٖ نَعْمَاءُ كُلِّ زَمَانِ
اُنْظُرْ اِلَيَّ بِرَحْمَةٍ وَّ تَحَنُّنٍ
يَا سَيِّدِيْ اَنَا اَحْقَرُ الْغِلْمَانِ
يَا حِبِّ اِنَّكَ قَدْ دَخَلْتَ مَحَبَّةً
فِيْ مُهْجَتِيْ وَمَدَارِكِيْ وَجَنَانِيْ
جِسْمِيْ يَطِيْرُ اِلَيْكَ مِنْ شَوْقٍ عَلَا
يَا لَيْتَ كَانَتْ قُوَّةُ الطَّيَرَانِ

اے اللہ تعالیٰ کے فیض اور عرفان کے چشمے۔ لوگ سخت پیاسوں کی طرح تیری طرف دوڑتے ہیں۔

اے انعام دینے اور احسان فرمانے والے خدا کے فضل کے سمندر لوگ فوج در فوج کوزے لیکر تیری طرف تیزی سے آ رہے ہیں۔

اے وہ جو اپنے نور اور روشنی میں مہر و ماہ کی طرح ہو گیا ہے اور اپنے نور سے رات دن کو منور کر دیا ہے۔

تُو نے صدیوں کے مُردے ایک جلوہ سے زندہ کر دیئے۔ کون ہے جو اِس شان میں تیرا نظیر ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ کا چہرہ اس کے چہرے میں نظر آتا ہے اور اسکے تمام حالات اسی شان کے ساتھ چمکتے ہیں۔

بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہتر مخلوقات اور صاحبِ کرم و عطا اور شرفاء لوگوں کی روح اور انکی قوت اور چیدہ اعیان ہیں۔

ہر قسم کی فضیلت کی صفات آپ میں اعلیٰ وجہ الاتم موجود ہیں اور ہر زمانے کی نعمت آپ کی ذات پر ختم ہے۔

مجھ پر رحم اور شفقت کی نظر کرنا۔ اے میرے آقا میں تیرا ایک ناچیز غلام ہوں۔

اے میرے پیارے تیری محبت میرے خون، میری جان، میرے حواس اور میرے دل میں رچ گئی ہے۔

میرا جسم شوقِ غالب کے سبب تیری طرف اُڑا جاتا ہے اے کاش مجھ میں قوتِ پرواز ہوتی۔

(شرح القصیدہ)

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

لطف الرحمٰن محمود
(سائنس)

پہچانیے تو؟

اگر آپ کی نگاہ کیمسٹری ایسے خشک مضمون کے پڑھنے پڑھانے والے کسی ایسے مرنجاں مرنج بزرگ پر پڑے جو مسرت وانبساط کی رنگینیوں سے لبریز، کیف آفریں قہقہے بکھیر رہا ہو تو فوراً آنکھیں بند کر کے ایمان لے آئیے کہ "بابائے ظرافت" یہی ہیں۔ البتہ ضعفِ بصارت کے مریضوں کے لئے پریشانی کافی ہے کہ صاحبِ موصوف کا چہرہ مرورِ ایام اور امتدادِ زمانہ کے گہرے نقوش کا امانت دار ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ محکمہ آثارِ قدیمہ پھاوڑے لے کر چڑھائی کر دے ——— ! مشرقی وضع قطع تو بھول ہی نہیں سکتی۔ وہی پاجامہ، اچکن، ٹوپی اور عینک۔ ہاں ہاتھ میں چھڑی کی بجائے تھیلہ سنبھالنے کے عادی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تھیلہ بھی سلیمانی ٹوپی کی طرح بڑا عجیب وغریب ہے۔ اس تھیلے کو دیکھو کہ فاضلِ اجل اخوند عبدالقادر مرحوم یاد آجاتے ہیں!

صاحبِ موصوف حجم، جسامت، کثافتِ اضافی، "جوہری وزن" (ATOMIC WEIGHT) اور اسٹرکچر (STRUCTURE) کے لحاظ سے قدرت کی ستم ظریفی کا شاہکار ہیں! مگر جب چلتے ہیں تو کم از کم موصوف خود یہ ضرور محسوس کرتے ہیں کہ زمین ساتھ ساتھ دبی جا رہی ہے۔ اس چال کو شاعرانہ اصطلاح میں "قیامت خیزی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بلکہ جو لوگ قیامت کے منکر ہوتے ہیں انہیں یہی ثبوت دیا جاتا ہے۔ اس لئے موصوف نرے پروفیسر ہی نہیں بلکہ قیامت کا اچھا خاصا ثبوت بھی ہیں! مشرقی وضع قطع میں داڑھی بھی شامل ہے ——— چھوٹی سی کھچڑی داڑھی ——— مگر اِس "چھوٹی سی" سے یہ مراد نہیں کہ غلطی سے کچھ بال ٹھوڑی پر رہ جاتے ہیں اور دور سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ پنیر کے ٹکڑے پر موسمِ سرما کی ماری ہوئی چیونٹیوں کی گول میز کانفرنس ہو رہی ہے ——— مطلب یہ ہے کہ داڑھی کا یہ سلسلہ "اس سطحِ مرتفع" کے علاوہ دوسرے "میدانی علاقے" پر بھی پھیلا ہوا ہے ——— مطلب یہ کہ ٹھوڑی کے علاوہ بھی داڑھی ہے!

پروفیسر موصوف، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے "بابائے ظرافت" ہیں۔ اس میں حاضر جوابی بھی شامل ہے۔ جب لیکچر کلائمکس پر پہنچتا ہے تو عجیب لذت محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے اسٹوری کا "کلائمکس" تو سنا ہوگا۔ اگر لیکچر کا کلائمکس دیکھنا ہو تو ذرا کیمسٹری کا ایک آدھ پیریڈ ہمارے ساتھ بھی Attend کر کے دیکھ لیجئے! ہر روز کلاس میں کوئی نہ کوئی لطیفہ ایسا چھوڑتے ہیں کہ حاضر جوابی پر انگشت بدنداں ہونا پڑتا ہے ——— کسی نے جمائی لی اور اِدھر لطیفہ ہوا ——— کسی کو اونگھ آئی اور اِدھر شگوفہ چھوٹا ———

چند دنوں کی بات ہے کہ شاگردوں نے بڑی رقت سے عرض کیا حضور روزے ہیں، آپ کی رفتار ماشاء اللہ جناب ایکسپریس کیا پائنیر مسٹ کی ہے، پرچوں میں کورس ذرا کم ہی رہنے دیں، اور ویسے بھی کچھ لچک اور نرمی ہو۔ فوراً گرجے "کیوں صاحب؟" شاگردوں نے روزوں کا واسطہ دیا ——— مگر بلا توقف گویا ہوئے "بھوکا بٹیر خوب لڑتا ہے۔ اس لئے پرچہ خوب مشکل ہوگا۔"

یہ حاضر جوابی اگر ورثے میں نہ ملتی تو بھلا کیمسٹری میں ایسی ظرافت کیسے پنپ سکتی ہے؟

ایک نیام میں دو تلواریں ہرگز نہیں سما سکتیں۔ کہاں کیمسٹری اور کہاں بذلہ سنجی۔ یہ پروفیسر صاحب کا معجزہ ہی ہے کہ

اُن کے وجود با جود کے کمبل میں یہ دونوں فقیر گزارہ کر رہے ہیں۔ جب طالب علم کسی طویل طویل اپریٹس کا حدود اربعہ اور پیچھے دار فارمولوں کا لامتناہی سلسلے کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور بے چینی چہروں سے جھانکنے لگتی ہے تو آپ کوئی لطیفہ سُناتے ہیں اور پھر آوے کا آوا زعفران زار بن جاتا ہے!!

موصوف کالج کے اُن چند اساتذہ میں سے ایک ہیں، جو وراثت کے حقوق اور ماحول کے اثرات کی وجہ سے شعر کہنے پر تو قادر ہیں مگر شعر کہنے پر آمادہ نہیں۔

بات یہاں تک ہی رہتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا مگر غضب تو یہ ہے کہ اِس معاملہ میں آنجناب کے خیالات ارسطو سے ملتے جُلتے ہیں۔ ارسطو تو سرے سے ہی شاعر کو عضوِ معطّل سے بھی ناکارہ شے تصوّر کرتے تھے مگر صاحبِ موصوف کا احسان بلکہ کرم بالائے کرم ہے کہ اتنی رعایت دینے پر آمادہ ہیں کہ جب قوم سیاسی، معاشی، اقتصادی، ذہنی، تعلیمی، جسمانی، حیاتیاتی، طبیعاتی اور کیمیائی، غرض ہر لحاظ سے مضبوط ہو تو شاعر کے پیدا ہونے اور پنپنے کے امکان کا جائزہ لیا جا سکتا ہے ـــــ ورنہ شاعروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ حضرت کے نزدیک شاعری "کارِ بے کاراں" ہے!! مگر ہم حیران ہیں کہ آپ ایسے خیالات کے حامل کیوں ہیں؟ حالانکہ آپ نے شاعرانہ اور ادیبانہ ماحول میں آنکھیں کھولیں اور شعروسخن کی گود میں پلے ہیں۔ آپ یقیناً پریشان ہو جائیں گے کہ آپ کے والدِ ماجد روزانہ داغ دہلوی مرحوم کے گھر جاتے اور کلام کی داد پاتے! ایسے بزرگوں کی اولاد اور شاعروں کی دشمن؟ ع

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لیکن شاعری کیمسٹری تو ہے نہیں کہ صرف پڑھنے سے ہی آتی ہو ـــ شاعری، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی تو ایسی بلائیں ہیں کہ قدرت نے اگر ان کی رمق تک ذہنِ انسانی میں چھپا دی ہو تو پھر ان کی لہریں سارے جسم میں حلول کر جاتی ہیں! ان سے پیچھا چھڑانا تو جُوئے شیر لانے کے مترادف ہے بلکہ اس سے بھی مشکل! یہی وجہ ہے کہ آپ کے ہاں باوجود ضبط کے اس قوت کا اظہار ہو ہی جاتا ہے اور بڑا موزوں اور پُر لطف! کیمسٹری والے تو شاعری کو حرام سمجھتے ہیں۔ شریعتِ کیمیا میں خود شعر کہنا تو کفر سے بھی بدتر سمجھا جاتا ہے اور دوسروں کا مصرع تک زبان پر لانا معیوب اور کیمیا کے فارمولوں کی توہین کے مترادف! مگر فطرتِ صحیحہ تو احسنِ تقویم ہوتی ہے اس لئے اکثر مصرع لب پر آ ہی جاتا ہے! یہی حال صاحبِ موصوف کا ہے!

ایک دن تابکاری (Radio activity) پر پُرمغز لیکچر ہو رہا تھا کہ اُن کے اثرات پر بحث چل نکلی۔ نوبت اُن کے Half life Periods تک آ گئی۔ موصوف نے بتایا کہ کئی تو ایسے ہیں کہ تقریباً دو ہزار سال کے بعد انکا ایک تغیر مکمل ہوتا ہے ـــــ یہ کہہ کر آپ کی حالت دگرگوں ہو گئی اور غالب کا یہ شعر ؎

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

کچھ اِس رقّت اور دلسوزی سے پڑھا کہ کلاس پر ایک مخصوص کیفیت طاری ہو گئی!

بہرحال اُن کے لطیفے شگوفے اور معرفت کے نکتے ـــ سُبحان اللہ ع

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی!

● پروفیسر موصوف عجائب و غرائب کا مجموعہ ہیں۔ مگر میں صرف ایک عجیب بات ہی بیان کروں گا اور وہ یہ کہ اتنی بڑی ڈگری کے حصول کے بعد بھی پڑھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ان کے دارالمطالعہ میں میرا کئی مرتبہ گزر ہوا ہے۔ میں نہیں کہ آندھی بگولے کی طرح بلکہ بارش اولے کی طرح کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تحقیقی و تنقیدی نظر سے اُن کی کتابوں کو سونگھا بھی ہے! یقین جانیئے اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے ہیں اگر تین چار اٹھا کر ایک اچھے بھلے آدمی کے سر پر دے ماری جائیں تو اُس بے چارے کا کچومر نکل جائے ـــــ کچومر کیا کفن دفن کا انتظام کرنا پڑے!! یہ نہیں کہ

صرف کتابیں ہی پڑھتے ہیں بلکہ آپ کے مشاغل بہت دلچسپ ہیں۔ کبھی قدِ آدم دُوربینیں لگا کر عالَمِ بالا کی سیر کا شوق فرماتے ہیں۔ کبھی مسیحایانہ لباس زیبِ تن کر کے اپنے باغیچے کے پودوں پر کیمیائی کھاد کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں ——— اور جب تجربہ کرتے کرتے پودوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے تو کلاس میں تجزیہ پیش کرنے لگتے ہیں! مگر اب کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت!!

مختصراً یہ کہ کوئی راکٹ چھوٹے، گھڑا پھوٹے یا کوئی اور شے ٹوٹے، بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ اُس کی کیمسٹری بیان کرنے لگتے ہیں بلکہ چودہ طبق روشن کر کے چھوڑتے ہیں۔ جب آپ کی طبعِ رسا رقص پر آمادہ ہوتی ہے تو پھر لیکچروں کا سیلاب کیمسٹری روم اور دارالتجربہ تک محدود نہیں رہتا بلکہ جامعہ احمدیہ کے ہال اور تحریک کے کمیٹی روم تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے!

بھلا ایک ایسا آدمی جس کی صحت پہ پہلے ہی کافی سے زیادہ فضلِ ربی ہے، جو دردِ گُردہ اور دردِ کمر کا مریض ہو کیا اُسے رات کے دو بجے تک مطالعہ میں مستغرق رہنا چاہیئے؟ انصاف کیجئے اب اس میں قدرت کا کیا قصور ہے ——— جس کے تمام دن خشک و تر کتابوں سے اُلجھنے میں گزر جائیں۔ دن طالب علموں سے سر کھپاتے گزریں ——— راتیں غور و فکر میں ارکات جائیں ——— اور طرّہ یہ کہ داخلہ روک کر امتحان سے محروم کئے جانے والے "شہدائے کرام" کی دُعائیں شاملِ حال ہوں تو بتائیے کہ وہ شخص سال میں ایک دو مرتبہ بسترِ علالت پہ کیوں نہ دراز ہو؟ آپ بے شک ایک نافع الناس وجود ہیں مگر قانونِ قدرت کس بھاڑ میں جائے؟ آخر بتیس دانتوں کی بھاگا کسر، بلاؤ کا نام ہے؟ بہرحال کہہ رہے تھے کہ اب کے اگر قانونِ قدرت ٹل گیا (اور خدا کرے ٹل جائے) تو کالج میں ایک ایسی سائنسی تماشہ کراؤں گا کہ لوگ یاد رکھیں گے!! ع

"آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!"

دردمندانہ دُعاؤں والا عقدہ شاید وا نہ ہوا ہو اس کی عقدہ کشائی بھی ضروری ہے۔ واضح ہو کہ آپ صرف جلسہ والوں کے "ناظم مکانات" ہی نہیں ہیں بلکہ کالج والوں کے "ناظم امتحانات" بھی ہیں۔ اور اس سلسلے میں سارا "خون بہا" اُن کے سر ہی پڑتا ہے! ——— سچی بات یہی ہے کہ آپ کے بغیر تو یہ کام چلنے سے رہا۔ آزاد منش طلبہ کو بھی موصوف کے مزاج کی خبر ہے اب اُن پر کھل گیا ہے کہ حضرت کے سینے میں کچی کلی ایسا نازک دل نہیں کہ چیخ و پکار کی لُو سے مُرجھا کر متاثر ہو سکے! امتحان کے معاملہ میں اُن کی سخت پالیسی کا ہی اثر ہے کہ کئی آزاد منش طالب علم بھی کڑا کر کے اپنی پالیسی کا راستہ ہموار اور درست کر لیتے ہیں!!

آپ کی کمزوریاں بھی عجیب و غریب ہیں۔ اگر کوئی قسمت کا مارا لیٹ آ جائے تو اس کے لئے زندہ درگور ہو جانا ہی زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسی صورتِ حال میں آپ کی حرارتِ غریزی اچانک حدِ اعتدال کو پھلانگ کر نقطۂ عروج تک پہنچ جاتی ہے ——— اور جب درجۂ حرارت بڑھ جاتا ہے تو بے چارے کو بھاڑ میں ڈال کر چھلنی میں اُڑاتے ہیں۔ اگر غصے کے عالم میں ٹکا سا جواب نہ دیں تو پھر طنزیہ انداز سے طرح طرح کی فرمائشوں سے ان حضرت کی ارتھی بڑی دُھوم دھام سے اُٹھاتے ہیں یہ فقرہ کہتے ہوئے جب ساری کلاس کھڑی کر دیتے ہیں تو ان حضرت پہ موت طاری ہو جاتی ہے

"SHALL WE ALL STAND TO HONOUR YOUR HIGHNESS?"

دوسری کمزوری آپ کی یہ ہے کہ وہ کلاس میں کسی کو عالَمِ خواب میں دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ کمزوری تو شاید تمام اساتذہ کرام میں ہو گی۔ مگر آپ کے تیوروں سے یہی آرزو ٹپکتی ہے کہ اگر اللہ میاں انہیں ——— توفیق بخشے اور قانون اجازت دے تو ایسے طالب علم کو چابک مار مار کر گنجا کرنے کی بجائے کرسی یا بنچ مار کر ابدی نیند سُلا دیں!

بہرحال موصوف صرف اللہ میاں کے حبیب نہیں، بلکہ طالب علموں کے بھی حبیب ہیں۔ اُن کی شفقت، خلوص، سادگی،

غصہ، مظلومیت، معصومیت، جبر، صبر، شاعر دشمنی، شاعر نوازی اور بذلہ سنجی —— ان سب نے مل جل کر انہیں ایک محبوب پروفیسر بنا دیا ہے۔ آپ کی لطیفہ گوئی اور شگوفہ سازی دیکھ کر اس عقیدے میں ترمیم کرنی پڑتی ہے کہ کیمسٹری گو ذوقِ شعری اور حسنِ طبع کا ستیا ناس کرتی ہے۔ مگر اب ممکن ہے ایک کیمسٹری جاننے والا لطیفہ گو اور بذلہ سنج بھی ہو۔ اگر ہم ایک جہاں دیدہ آدمی سے یہ سوال کریں کہ ایک ایسا شخص جسے ہائیڈروجن سلفائیڈ سے محبت ہو —— جسے سایانائیڈ سے عشق ہو۔ جسے کلورین اور سلفر ڈائی آکسائیڈ سے الفت ہو۔ اور جن کا فاسفین سے گہرا لگاؤ ہو —— کیا وہ بھی لطیفہ گو ہو سکتا ہے؟ پہلے اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ مگر موصوف کے لیکچروں سے دو تین دن محظوظ ہونے کے بعد وہ بلا خوفِ تردید کہہ سکے گا —— "ہاں ہو سکتا ہے"!

نقد و نظر

(بقیہ صلا)

ایک بات جسے سیلانی نے بہت محسوس کیا ہے وہ انتظامی امور کے سلسلے میں چند خامیوں سے متعلق ہے۔ جب کبھی جوشِ خطابت سے متاثر ہو کر سیلانی لیکچر کی طرف متوجہ ہوتا تو کسی نہ کسی آفت کے نزول سے یہ تسلسل ٹوٹ جاتا۔ کبھی بلیک بورڈ آ رہا ہے۔ کبھی ڈسٹر درکار ہے۔ کبھی چاک کی تلاش ہے۔ کبھی کسی عہدیدار کو باہر جانے کی ضرورت پڑ گئی ہے تو کبھی کسی کو اندر آنے پر اصرار ہے۔ یہ چیزیں پہلے ہی تیار ہونی چاہئیں۔ سیلانی کو امید ہے کہ آئندہ یہ بزرگ محتاط رہیں گے۔ ووٹ لیکر کرسیوں سے چپک جانا کوئی بڑا معجزہ نہیں —— بلکہ اصل کرامت تو ایسی خامیاں دور کرنا ہے، جو اچھے بھلے جلسوں کا مزا کرکرا کر دیتی ہیں۔

سمیع اللہ ایم۔ اے

اب تو جیسی ہے بھلی ہے یارو!

کوئی آہٹ کوئی آواز نہیں
یاد سنسان گلی ہے یارو
زندگی کو کوئی الزام نہ دو
اب تو جیسی ہے بھلی ہے یارو
جس کو دیکھیں وہی شرما جائے
یہ بھی اک ریت چلی ہے یارو
میری خواہش کو نہ بدنام کرو
یہ بھی نازوں کی پلی ہے یارو
شوخ نظروں کی اسے تاب کہاں
دل تو معصوم کلی ہے یارو

عبدالسلام اختر ایم۔اے

افکارِ عالیہ

بستی بستی گھومنے والو پایا کچھ تسکین کا سایا
اس کی شان کے صدقے جس نے دُنیا بخشی آپنے آپ آیا

دُور تھا یا نزدیک تھا تُو یہ میری ہی کوتاہ نظر تھی
جس نے جتنا جتنا ڈھونڈا اُس نے اتنا اُتنا پایا

آتو چکے ہو چھوڑ کے اپنی جنّت اے نو واردِ ہستی!
آؤ یہاں اب غور سے دیکھو کون اپنا ہے کون پرایا

کون شریکِ حال تھا میرے عمر یہاں جب بیت رہی تھی
عقل کے چکّر۔ وقت کی گردش۔ ذہن کی اُلجھن روح کا سایا

ہفت افلاک کی منزل کیا ہے روحِ جہاں بھی تھراتی ہے
"کون ستارے چھو سکتا ہے۔ راہ میں سانس اُکھڑ جاتی ہے"

قریشی ضیاء الحق
فنون

تصوّف کیا ہے؟

لفظ "تصوّف" ہمیشہ زیر بحث رہا ہے۔ لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ دراصل یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کی حقیقت بیان کرنے میں ہماری فصیح سے فصیح عبارتیں۔ فصیح بیانات اور فصیح ترین ترکیبات لفظی تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں نامحرمانِ بزم تصوّف کا تو ذکر ہی کیا خود صدر نشینانِ محفل تصوّف اس کی ایسی تعریف کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ جو جامع اور مانع ہو۔ انہوں نے بے شمار طریقوں سے اس کی حقیقت بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہر تعریف لفظی اس کے ایک یا چند پہلوؤں کو واضح کرتی ہے الفاظ کا کوئی انتخاب ایسا نہیں ملتا جو اس کو پورے طور پر بے نقاب کر سکے ذیل میں چند تعریفات پیش کی جاتی ہیں۔ جن سے ہماری کسی حد تک رہنمائی ہوتی ہے:۔

۱:۔ حضرت داتا گنج بخش اپنی کتاب "کشف المحجوب" کے صفحہ ۴۲ پر فرماتے ہیں:۔
فرماتے ہیں:۔ "تصوّف ایک حقیقت ہے جس کیلئے کوئی رسم نہیں۔"

۲:۔ ذوالنون مصری فرماتے ہیں "صوفی وہ ہیں جنہوں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خدا کو لیا ہے۔" (الغزالی صفحہ ۱۱۵)

۳:۔ علّامہ شبلی "کشف المحجوب" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:۔
"صوفی وہ ہوتا ہے جو دونوں جہان میں بجز اللہ عزّوجل اور کسی کو نہ دیکھے۔"

۴:۔ "تصوّف خلق نیک کا نام ہے۔" (مرتعش ؒ)

تعریفات بالا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صوفی جس مقام میں ہے اور جس زاویہ نگاہ سے وہ مشاہدہ حقیقت کر رہا ہے۔ اسی کے اعتبار سے اس نے اس کو سمجھا ہے۔ اور بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی صورت میں کسی تعریف کو مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ رجوع اللہ۔ ترک ماسوا اللہ قناعت و توکل۔ تسلیم و رضا۔ تزکیۂ نفس اور استغراق تصوّف کے مختلف پہلو ہیں۔ اصل مقصد حقیقت مطلقہ کی تلاش ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اخلاقی صفات سے آراستہ ہو اور حقیقت مطلوبہ سے اس کا تعلق خلوص آمیز اور مستحکم قرار دیا جا سکے۔ محبوب حقیقی جوہر تقدس سے آراستہ و پیراستہ ہے اس لئے تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کے بغیر اس سے واصل ہونا ممکن نہیں۔ ضرورت ہے کہ کوئی ایسا ضابطۂ فکر و عمل ترتیب دیا جائے جو نفس کی کثافتوں کو دور کر کے انسان کو تقرب خدا کا ذریعہ بنا سکے۔ لیکن ملحوظ رہے کہ یہ بھی تصوّف کی نہیں بلکہ فن تصوّف کی تعریف ہوئی۔ نفس تصوّف کی تعریف حد امکان سے باہر ہے۔ وہ کسی خاص طریقہ عبادت یا آئین پرستی کا نام نہیں۔ بلکہ بادۂ بے نام کا نشۂ روح محبّت کا نغمہ، کائنات کے دل کی دھڑکن اور قلب انسانیت کی آواز ہے۔ اور وہ فطرت کے تمام پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے تصوّف قلب انسانی کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ جو سرتا پا ذوق وجدان ہے اندر رھل کے الفاظ میں "حقیقی تصوّف کی بنیاد انسان کی شخصیت میں جاگزین ہے۔ اس لئے اساسی طور پر وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو صرف قلب سے تعلق رکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس "معنی بے لفظ" کی تعریف کرنے میں ہر بامعنی لفظ بے معنی ثابت ہوتا ہے۔"[۱]

جس طرح تصوّف کی تعریف ناقابل یقین ہے۔ اسی طرح اس کی وجہ تسمیہ بھی اختلاف خیال کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ مولانا شبلی، امام غزالیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"امام صاحب موصوف نے ایک موقعہ پر تصوّف

---

۱ MYSTICISM. P. 82

کی وجہ تسمیہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس لفظ کے اشتقاق کے متعلق تین رائیں ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ صحابہ میں سے جو لوگ اہلِ صفہ کہلاتے تھے ان کی طرف منسوب ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا ماخذ صفا ہے۔ بعض کے نزدیک صف۔ لیکن قاعدۂ اشتقاق کی رُو سے یہ تمام اقوال غلط ہیں[1]۔"

مولانا شبلی اسی مقام پر آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

"یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ صوف سے ماخوذ ہے جس کے معنی پشمینہ کے ہیں۔ لیکن پشمینہ پوش ہونا اس فرقے کی کوئی خصوصیت نہیں۔"

لیکن حضرت علی الہجویری کی رائے اس کے خلاف ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق لباس صوف اہل تصوّف کا امتیازی نشان تھا۔ یہی نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت بھی ہے۔ ثبوت میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں :۔

علیکم تلبس الصوف تجدون
حلاوۃ الایمان فی قلوبکم۔

یعنی صوف کا لباس اختیار کرو۔ تم اپنے دل میں حلاوتِ ایمان پاؤ گے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہیں۔ انہوں نے حضرت حسن بصری کا یہ قول پیش کیا ہے کہ انہوں نے ستر اہلِ بدر کو دیکھا (گویا وہ صوفی تھے) جن کی پوشاک صوف تھی۔ پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ "ہمیشہ صالحین اور زہاد اور متقین اور عباد کو صوف ہی کا لباس مرغوب رہا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عہد نبوی کے زہد پسند بزرگوں کو اوّلین صوفیاء میں تسلیم کرا لیا جائے تو تصوّف آسانی کے ساتھ صوف میں سے مشتق قرار دیا جا سکتا ہے۔ مستشرقین یورپ نے بھی اسی نظریے کی حمایت کی ہے۔

مولانا عبدالحلیم صاحب شرر علامہ ابن جوزی کے حوالہ سے لفظ صوفی پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں :۔

"جاہلیت عرب میں صوفہ نام ایک گروہ تھا۔ جو لوگ تارک الدنیا ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہو جاتے اور کعبہ کے پاس بیٹھ رہا کرتے، یہ لوگ خاندان غوث بن مرّ میں سے تھے جو تیم بن مرہ کا ایک قبیلہ تھا۔ پھر بعثتِ نبوی کے بعد اسلام میں جو لوگ ان کے ہم خیال پیدا ہوئے وہ بھی ان کی طرف منسوب ہو کر صوفی کہے جانے لگے[2]۔"

ڈاکٹر نکلسن نے تصوّف کو صوف سے مشتق قرار دیا ہے۔ اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ ایران میں صوفی کو پشمینہ پوش کہتے ہیں اور یہ محض صوف کی رعایت ہے۔ عہدِ رسالت کے عباد و زہاد میں تصوّف کے آثار اچھی طرح نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف بعض اکابر صوفیاء صفا کی صحت پر زور دیتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ مادہ صفاء سے بابِ مفاعلت پر مصافات مصدر ہوئی اور ماضی معروف صفّی اور ماضی مجہول صُوفی قرار پا گئی[3]۔

حضرت علی ہجویری زیادہ زور صفاء پر ہی دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام دوسرے معانی بجز لفظ صفاء کمزور ہیں اس لئے صفا سب سے بہتر ہے۔ اس لحاظ سے کہ اہلِ تصوّف کا مقصد صفائے باطن ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حامیانِ صفا کے اقوال بھی حقیقت سے بعید معلوم نہیں ہوتے۔

اسی طرح تصوّف صفہ سے مشتق قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اہلِ صفہ کی روشِ حیات صوفیاء کے طریق سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ ترکِ لذات، عزلت نشینی، کثرتِ ذکر و عبادات وغیرہ اہلِ تصوّف کے تمام اوصاف اہلِ صفہ میں نظر آتے ہیں۔ اسلئے صوفیاء

---

[1] الغزالی ص ۱۱۴

[2] مضمون از مولوی عبدالحلیم شرر مشمولہ رسالہ التصوّف لاہور جون ۱۹۳۲ء

[3] ENCYCLOPEDEA OF ISLAM VOL.4 P. 682

تصوف کیسے ظہور میں آیا؟

مذاقِ تصوف کی تخلیق اہلِ اسلام میں تمام دوسری ملل عالم کی طرح غیر شعوری طور پر ہوئی۔ پہلے سے اس کا کوئی ضابطۂ فکر و عمل موجود نہ تھا۔ اس مسلک خاص کو بالارادہ وضع نہیں کیا گیا۔ اس کے لئے کسی مجلس یا انجمن کا قیام عمل میں نہیں آیا۔ نہ کوئی تجویز پیش کی گئی۔ نہ اس کی دوسروں نے تائید کی۔ نہ کثرت آراء یا اتفاق آراء سے یہ تجویز منظور کرائی گئی۔ تصوف کوئی پیغام نہ تھا جو الفاظ کے ذریعے کانوں تک یا کلک و قرطاس کے ذریعے آنکھوں تک پہنچایا گیا ہو بلکہ ایک انسانی جذبہ تھا جو دیگر مذاہب کی طرح پیروانِ اسلام میں ساز گار حالات کے ہوتے ہوتے تشکیل پا گیا اور رفتہ رفتہ اس میں ایسی رنگ آمیزیاں ہوئیں کہ اب تو بعض اوقات اس کی صورت پہچاننے میں بھی دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ ان اشکال کی بنا پر اس کے ماخذ کے بارے میں متعدد نظریے پیش کئے گئے ہیں جن میں سے چار خاص طور پر موضوع بحث قرار دیئے جا سکتے ہیں:-

(۱) تصوف ایک خود رو تحریک ہے۔

(۲) تصوف سامی مذہب کے خلاف ایک آریائی ردعمل ہے۔

(۳) تصوف اشراقیت جدید (NEW PLATONISM)

(۴) تصوف کا ماخذ خالص اسلامی تعلیم ہے

سطور ذیل میں ان تمام نظریات کی کسی قدر تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

(۱) پہلے نظریے کے مطابق تصوف ایک خود رو تحریک ہے جو بغیر کسی داخلی یا خارجی اثر کے ظہور میں آ گئی۔ یہ نظریہ اگرچہ جزوی طور پر صحیح ہے لیکن جس خیال پر اس کو قائم کیا گیا وہ سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اسلام میں عام طور پر ظاہریت اور مراسم پرستی کا بازار گرم تھا۔ اور ان حالات میں پرشوق روحوں کے واسطے کوئی سامانِ سکون و طمانیت موجود نہ تھا۔ اس کی تائید اس طرح کی جاتی ہے کہ ابتدائی دور کے اہل تصوف حضرت ابراہیم بن ادہم، داؤد طائی، سفیان ثوری اور ابوہاشم وغیرہ کے جو اقوال دستیاب ہوتے ہیں وہ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ یہ لوگ مروجہ رسوم پرستی اور ضابطہ آرائی کے علاوہ کسی عمیق تر اور زیادہ اطمینان بخش شے کے متلاشی تھے۔ وہ عشقِ الٰہی میں خلوص کے درجۂ کمال پر فائض تھے اور ان کے تمام مشاغل عشق و عبادات محض تقرب خدا کی نیت سے ہوتے تھے نہ کہ اس عذاب کے خوف سے یا تمنائے رحمت میں جو خدا کی طرف سے نازل ہوتی۔[1] اور چونکہ اسلام میں اس ارتقائے روحانی کی گنجائش نہیں تھی اس لئے انہوں نے علیحدہ روحانی مسلک کی بنیاد ڈالی لیکن یہ خیالات حقیقت سے بہت بعید ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام انسان کو پیکر عمل بنانا چاہتا ہے مگر اس کے ساتھ روحانی زندگی کے مقدس و منور ابواب وا کر دیئے ہیں۔ زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں صرف حضرت علیؓ کا ارشاد اس کی تردید کے لئے کہ اسلام میں خلوص عبادت کی کمی تھی کافی ہے۔ فرماتے ہیں:-

مَا عَبَدْتُکَ یَا رَبِّ شَوْقاً اِلٰی جَنَّتِکَ وَلَا خَوْفاً مِنْ نَارِکَ بَلْ وَجَدْتُکَ اَھْلاً لَہٗ۔

آپ زمانۂ رسالت میں موجود تھے اسلئے آپ کا ارشاد پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام میں حقیقی ذوقِ عبادات اور ارتقائے روحانی کے لئے کسی کمی کی گنجائش محسوس ہو سکتی ہے۔

(۲) اس نظریے کے مطابق تصوف ایک غیر جذبی سامی مذہب کے خلاف ایک آریائی ردعمل کی صورت میں نمودار ہوا۔

---

[1] LITERATARY HISTORY OF PERSIA VOL. I P. 424

اس کا مطلب یہ ہے کہ آریائی (یعنی ایرانی اور ہندی) مذاہب کے لوگ روحانی مسائل اور فلسفیانہ افکار میں اس وقت بہت سی منازلِ ارتقاء طے کر چکے تھے۔ جبکہ وہ بہ جبر و اکراہ اسلام قبول کرنے پر مجبور کئے گئے، جو محض لبطرِ سیاسیات سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد آریائی مذاہب کے افکارِ کہنہ عود کر آئے۔ ان افکار اور تعلیماتِ اسلامی کے درمیان ایک اختلاف پیدا ہونے لگا۔ عقائدِ اسلام سے خلاصی پانا ناممکن تھا ساتھ ہی اپنے عقائدِ کہنہ کو رد کرنا بھی دشوار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرح کی مفاہمت عمل میں آئی اور اسی مفاہمت کا نام تصوّف ہے۔ لیکن یہ نظریہ بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

(۳) ایک گروہ اشراقیت جدید (NEW PLATONISM) کو تصوّف کا ماخذ بتاتا ہے۔ اشراقیت ایک روحانی فلسفہ ہے جس کا بانی اوّل افلاطون یونانی تھا۔ اشراقیت جدید وہ دبستانِ علم ہے جو بہت بعد میں فلاطینوس (۲۰۴ء سے ۲۷۰ء) نے قائم کیا[1]۔ اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو حقیقتِ مطلقہ یعنی خالقِ کائنات کا علم و عرفان حاصل کر کے اس سے واصل ہو جانا چاہیئے۔ اس میں ایک ایسی استعداد موجود ہے جس کی مدد سے وہ اپنے تجرباتی علوم کی حد سے گزر کر حقیقتِ واحدہ کا وجدانی علم پا سکتا ہے اور اپنی شخصیت کو فنا کر کے اس لامحدود ذات سے واصل ہو سکتا ہے۔"

لیکن اصل بات یہ ہے کہ تصوّف اپنے آغاز کیلئے اشراقیت جدید کا رہینِ منت نہیں۔ مسلمان جس زمانے میں پہلے پہل فلسفۂ یونان سے روشناس ہوئے وہ زمانہ مامون الرشید کی خلافت کا زمانہ تھا۔ مسلمان اشراقیت جدید کو یونانی وساطت سے ہی سمجھ سکتے تھے۔ فلسفۂ یونانی کی آمد مسلمانوں میں تیسری صدی ہجری میں ہوئی لیکن تصوّف اس سے پیشتر وجود میں آچکا تھا اسلئے اشراقیت کو تصوّف کا ماخذ نہیں بلکہ فلسفۂ تصوّف کا فروغ قرار دیا جا سکتا ہے۔

---

[1] Cambridge Encyclopaedia VOL. XIII — P. 242

محمد مہدی مونس
(فنون)

غزل

لذّتِ عشق میں ایسا ہے یہ تن من میرا
مجھکو معلوم نہیں کون ہے دشمن میرا

میری حالت یہ یوں بے خودی نگاہیں اُٹھا
عشق میں ایسا ہی ہر وقت ہے اُمن میرا

یہ سرائے نہ چمن ہے میرا غربت خانہ
عالمِ خاک سے ہے دور نشیمن میرا

مثلِ سایہ ہوں ہر اک جا پہ حقیقی طالب
جس جگہ بھی ہوں بنِ خار ہے مسکن میرا

وائے افسوس تھکا اسپِ علوِ ہمّت
اُس سفر میں جہاں ہر گام ہے رہزن میرا

یہ حقیقت کہیں ڈر ہے نہ بن جائے سراب
پھر پراگندہ ہوا چہرہ روشن میرا

دیکھنے والے مجھے بھیگی ہوئی پلکوں سے
تشنہ دل آج بھی ہے چشمہ سوزن میرا

وقت کے ساتھ بدلتے ہی رہے وہ مونس
سیلِ گریہ میں بدستور ہے خرمن میرا

سلیم اختر صدیقی
(فنون)

ثقافتِ اسلامیہ؟

(جناب خلیفہ صلاح الدین احمد کی تصنیف "اسلامک کلچر" کے چند اقتباسات کا عکس)

(قسط دوم)

ایک مخالف حیرانگی کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ کچھ جانور مثال کے طور پر کیڑے اور شہد کی مکھیاں سوشل زندگی کا ایک رستہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جو کہ تعجب خیز طور پہ انسانی پالیسی کی عکاسی کرتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان بھی اسی طریقہ سے ایک بہتر کلچر حاصل کر سکتا ہے جو کہ علمِ حیات کے اُصول "Survival for the fittest" پر مبنی ہو۔ یعنی جو ماحول کا اور حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے اُسے زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ تو اس کا مطلب تو یہ بن جاتا ہے کہ طاقت ور اور اس کا کلچر دُنیا پہ غالب آجائیں اور کمزور اپنے نظریات کے ساتھ معدوم ہو جائیں۔ لیکن ہم اس بات کو نظر انداز کرتے ہیں کہ آیا یہ اصول عمومی طور پر قابلِ عمل ہے بھی کہ نہیں لیکن یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ جانوروں کی اکثریت کمزور مخلوقات پر مشتمل ہے اور اس کے باوجود بھی وہ ترقی پذیر ہیں۔ اسلئے جانوروں کی حیات کا اصول مندرجہ بالا ـــــ علم الحیات کے اصول سے قطعاً مختلف ہونا ضروری ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کیڑوں اور شہد کی مکھیوں کی زندگی کا دارومدار اُن کی سوشل اور زبردست طور پر تعاونی زندگی کا مظاہرہ ہے اور جس کے برعکس سوشل زندگی کی عدم موجودگی میں انسانی زندگی بہت مشکل نظر آتی ہے لیکن اس امر میں آزاد ہے کہ وہ زندگی کا کوئی راستہ اختیار کرے جو کہ اس کے واسطے نقصان دہ ہو یا منافع بخش۔ اور یہ بات تجربات اور مطالعہ سے پایۂ تکمیل کو پہنچا دی ہے کہ جانور اپنی سوچ بچار سے اپنے جادۂ حیات سے منحرف نہیں ہو سکتے ہیں جیسا کہ انسان ہو سکتا ہے۔ لیکن اس امر سے بھی کسی کو انکار نہیں ہے کہ جانوروں میں بھی احساس کا مادہ ہوتا ہے لیکن یہ الگ بات ہے۔ کہ اُن کی حرکات ایک محدود حلقہ میں گھر کے رہ جاتی ہیں۔

لیکن یہ بات قرآن مجید میں بیان کر دی گئی ہے کہ انسان کو مجبور نہیں کیا گیا ہے کہ وہ فلاں مخصوص راہ پر چلے۔ بلکہ اُسے آزادی دی گئی ہے کہ وہ اپنی عقل و فہم کو کام میں لا کر خدا تعالےٰ کے بتائے ہوئے قانون سے غلط یا صحیح کسی راہ کو اپنے لئے چُن لے۔ خدا تعالےٰ نے انسانی عقل میں نیک و بد کی تمیز رکھ دی ہے جو کہ اُسے دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی لئے خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ "انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہی کہ جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔" اور اس کے برعکس جانوروں کے متعلق خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ وہ وہی کچھ کرتے ہیں جو کچھ کہ اُن کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ دوسرے خدا تعالےٰ نے جانور ہمارے لئے نشان بنائے ہیں کہ جن کو دیکھ کر ہم کوئی راستہ اختیار کر لیں مجلسی یا غیر مجلسی، رحم یا ظلم کا، زاہدانہ یا شیطانی راہِ عمل اختیار کرنے میں آزادی صرف انسان کو دی گئی ہے اور ان کے واسطے ہر موقع میسر ہے۔ چاہے وہ خدا تعالےٰ کی خوشنودی حاصل کر لیں چاہے ۔۔۔۔۔؟

کلچر کے مسئلہ کے متعلق کسی اور ارتقائی غلط فہمی کو دُور کرنے

کے لئے ذیل میں سر ایلیٹ سمتھ کے الفاظ درج کرتا ہوں :۔

"اگرچہ ارتقاء کا لفظ فلسفہ اخلاق میں بہت مدت سے مستعمل ہے۔ لیکن وہ خیال کہ جس کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے غیر خوش کن طور پر بہت ہی پرانا ہے۔ اور اگر ہم تحقیق کریں تو یہ لفظ ہمیں ۱۸ صدی سے استعمال میں نظر آتا ہے۔ لیکن جب اس خیال نے ارتقاء کا اشتہار اپنے اوپر چسپاں کر لیا۔ تب سے یہ لفظ ایک خوشنما محاورہ بن کے رہ گیا۔ اور تنقید کی صعوبت سے بھی مبرا ہو گیا اور کلچر میں آنا د ترقی کا خیال آہستہ آہستہ ایک مستقل اصول بن گیا۔

. . . . اس لئے یہ امر خطرناک ہے کہ ہم علم الحیات کے لفظ ارتقاء کو کلچرل تاریخ میں استعمال کریں یا اُن حالات کے لئے استعمال کریں جو کہ بنیادی طور پر ہی مختلف واقع ہوئے ہیں جیسے کہ موجودہ دور کے صاحب علم اصحاب استعمال کر رہے ہیں۔" (ارتقاء علم جدید کی روشنی میں صفحہ ۲۲۹ - ۲۱۵)

یہ ایک الگ امر ہے کہ ایک شخص سائنس کے اصولوں کی اندھا دھند پیروی کریں۔ لیکن اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ نئے کلچر ز انقلابات کی مانند آزادانہ طور پر ترقی کرتے ہیں اور ارتقاء کی پیروی نہیں کرتے ہیں تاکہ انسانیت کو تباہی کے گڑھے سے بچایا جائے اور ان کے لئے ترقی کی نئی پُر امن راہیں کھول دی جائیں۔

موجودہ دور کا کلچر جسے ہم بیسویں صدی کی ایک ایسی تہذیب کہہ سکتے ہیں جو کہ مادیت کی جانب جھک گئی ہے اور اسی قسم کے دوسرے کلچرز جو کہ اوّل الذکر کے نقش قدم پر چل رہے ہیں زندگی کے صرف ایک شعبہ سے متعلق ہیں لیکن دوسری تصویر جو کہ روحانی یا انسان کی نفسیاتی طرف کی تصویر کہلاتی ہے اس کو بالکل پس پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں انسانی زندگی کی مادی تصویر نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ زندگی کے دوسرے رُخ کی تصویر کو قطعاً فراموش کر دیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل اسلام بالکل مختلف نظریہ پیش کرتا ہے کہ جس میں زندگی کی دونوں تصاویر کو مدنظر رکھا گیا ہے اور جیسا کہ ہمیں دُعا سکھلائی گئی ہے کہ اے خدا ہمیں اس دُنیا میں بھی خوشحالی اور آئندہ آنے والے دور میں بھی خوشحالی عطا فرما۔

یہ ایک ناانصافی ہو گی کہ اگر ہم یہ کہیں کہ اسلامی کلچر بطور مذہبی نظام مادی ترقی کے لئے ہمیں سہولتیں اور ہدایات بہم نہیں پہنچاتا ہے بلکہ اسلام نے تو کھلے طور پر کہہ دیا ہے کہ جو کچھ اس دُنیا میں ہے وہ سب کچھ تمہاری بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ نہ صرف یہی کچھ ہے بلکہ حکم دیتا ہے۔ کہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ظہورِ اسلام کے ساتھ صدیوں کے مدفون خزائن جو کہ فلسفہ اور سائنس کے تھے انہیں باہر نکالا گیا اور مقابلۃً ایک تھوڑے سے عرصہ میں اُن میں کمال پیدا کیا گیا اور سائنس کی تعلیمات کو ایک مذہبی فریضہ کے طور پر حاصل کرنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن بعد میں لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے مذہبی تعلیمات کو پس پُشت ڈالا گیا اور دوسری چیزوں کی طرف بھی کم توجہ دی گئی۔ اس سے صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ مسلم سوسائٹی اس وقت تک قطعاً ترقی نہیں کر سکتی ہے۔ جب تک کہ اسلام کا دوبارہ احیاء نہ ہو۔ (باقی)

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے! نمناک نہیں ہے!
(اقبال)

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!
(اقبال)

مہر اللہ یار
(فنون)

مرزا فرحت اللہ بیگ کا اسلوبِ بیان

دہلی بھی دُنیا کے اُن چند شہروں میں سے ایک ایسا شہر جس نے ہر زمانہ میں اپنے دامن سے ایسے خوبصورت اور قیمتی پھول برسائے جن کی خوشبو نہ صرف ہندوستان کی سرزمین کو معطّر کرتی رہی بلکہ سمندر پار کے ممالک بھی اس سے متاثر ہوئے۔

جس طرح سیاسی لحاظ سے دہلی ہندوستان کا دل قرار دیا جاتا ہے اسی طرح ادبی لحاظ سے اسے ادب کی تخلیق کا منبع بھی کہا جا سکتا ہے۔

جہاں اس نے غالبؔ جیسے عظیم شاعر اور آزادؔ جیسے انشا پرداز پیدا کئے وہاں مرزا فرحت اللہ بیگ جیسے اہلِ قلم حضرات بھی پیدا کر کے اُردو ادب کی بے حد خدمت کی۔

مرزا صاحب اُردو زبان کے بہت بڑے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کے مزاح نگار بھی ہیں۔ آپ اُردو زبان کے واحد ادیب ہیں جن کے ہاں یہ دونوں رنگ مخصوص حالت میں نظر آتے ہیں۔ آپ نے اپنی تحریر میں پُرکشش زبان، چست الفاظ اور دلکش اندازِ بیان کے ساتھ ساتھ ہنسانے والے واقعات بھی لا کر عبارت میں ایسی روانی اور چٹکیاں پیدا کر دی ہیں کہ تعریف احاطہ تحریر سے باہر ہے اور پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔

آپ کی تحریر کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں جن سے آپ کی تحریر کی خوبیاں نمایاں ہو جاتی ہیں :۔

"یہ کون ہیں؟ کہ مرزا صاحب! آئیے آئیے مرزا صاحب! آپ کی تو شکل ہی نظر نہیں آتی۔ آئیے بیٹھئے مرزا صاحب کی شکل ملاحظہ فرمائیے۔

سات فٹ کا قد۔ سفید رنگ۔ کتابی چہرہ۔ ستواں ناک غلافی آنکھیں ان میں قدرتی لال ڈورے۔ چڑھی ہوئی داڑھی جس کا ایک ایک بال سرکارِ انگریزی کی فوج کی طرح اپنی اپنی جگہ اٹینشن (استادہ) ہاتھ میں رام پوری بانس کی چھڑی اور چاندی کی موٹھ نیچے لوہے کی شام۔ ہنستے ہوئے آئے اور نہایت متانت کے ساتھ ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔"

اب آپ محسوس کریں گے کہ مرزا صاحب نے کس انداز سے اپنے دوست کی آؤ بھگت کی اور ان کے استقبال میں کیسے چست اور اچھوتے فقرات کہہ دیئے۔ اور ساتھ ہی اس مجلس میں آپ کو بھی شامل ہونے کی دعوت دی۔ اور آپ کے سامنے مرزا صاحب کی شکل کا ہو بہو نقشہ پیش کیا اور لطف یہ کہ بہت سادہ اور چھوٹے فقرات کو بھی لکھ کر عبارت کی روانی اور تسلسل کو برقرار رکھا۔ اور ساتھ ہی عبارت میں مزاحیہ رنگ بھی بھرتے گئے ہیں جس سے عبارت میں جا بجا شگفتگی اور تازگی پیدا ہو گئی ہے۔

آپ جب بھی کسی مصنف کی تحریر کو پڑھتے ہیں تو آپ اُس وقت تک اُس کی تحریر کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے جب تک کہ سارا مضمون یا کہانی پڑھ نہ لی جائے۔ مگر آپ کے ایک ایک فقرہ میں وہ تمام خوبیاں یکجا نظر آتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے چند فقرات کے پڑھنے سے آپ کی تحریر کے سارے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں مگر دوسرے ادیب ساری تحریر ختم کرنے کے بعد بھی اس خوبی سے محروم ہی رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب آپ کی تحریر پڑھی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دلّی کا بہت بڑا زبان دان اپنی زبان میں گفتگو کر رہا ہے۔ مثلاً آپ لکھتے ہیں :۔

"تم بہت دنوں بعد ملے ہو۔ کہاں تھے ——
کیسے ہو —— والد صاحب تو بخیریت ہیں ——
اور لوگ کہاں ہیں ؟"

حقیقت میں یہی چیز ہے جس نے آپ کا مقام بہت بلند رکھا۔ کیونکہ آپ کی تحریر عوام کی زبان تھی اور لوگ اسے پسند کرنے لگے۔

جہاں آپ نے اپنی تحریر میں روانی، شائستگی اور سادگی کے رنگ کو جنم دے کر شہرت حاصل کی وہاں آپ کی تحریر نفسیاتی تجزیے سے بھی خالی نہیں۔ آپ زندگی کا فلسفہ بیان کرتے ہیں کہ:۔

"زندگی کے بس دو ہی پہلو ہیں۔ زندہ دلی اور مُردہ دلی۔ ایک وہ لوگ ہیں جو مصیبت میں بھی ہنستے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو خوشی میں بھی روتے ہیں۔ ایک مرنے کو جینا سمجھتے ہیں دوسرے جینے کو مرنا۔ زندگی کے ان ہی دو پہلوؤں نے کبھی مذہب کی شکل اختیار کی اور کبھی فلسفے کے مکتبوں کی صورت۔

غرض دُنیا بھر کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک رونی صورت اور دوسری ہنسی صورت۔ کوئی انشا بنا کوئی میر۔"

آپ کی ایک اور بڑی خوبی جو آپ کی تحریر کو زیادہ دلکش بناتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی تحریر قافیہ بندی کے بکھیڑوں سے بھی خالی نہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ نے رجب علی بیگ سرور کی طرح ساری عبارت قافیہ پیمائی کی نظر کر کے مشکل بنا دی ہو۔ بلکہ آپ نے یہ رنگ محض عبارت میں چٹکیاں بھرنے کے لئے کہیں کہیں ظاہر کیا ہے۔ اگر آپ کا مقصد اہل زبان پر دھاک بٹھانا ہوتا تو شاید یہ مقام آپ کو نصیب نہ ہوتا۔ چنانچہ اس فرق کو نمایاں کرنے کے لئے سب سے پہلے میں سرور صاحب کی ہی تحریر کو پیش کرتا ہوں۔ آپ لکھنؤ کے پان کی تعریف کرتے ہیں:۔

"گھُنّی کا مُنہ کالا۔ ہوا گرد کر ڈالا۔ عبیر ہے نہ گال ہے۔ کتھے چونے سے آدھی میں مکھڑا لال ہے۔"

مگر مرزا صاحب نے جہاں کہیں اس قسم کا رنگ پیدا کیا ہے یا اپنی تحریر میں کہیں کہیں محاورات کا استعمال کیا ہے۔ تو بڑے سادے رنگ میں کیا ہے۔ جس سے پڑھنے والا کافی عبارت پڑھنے کے بعد جب تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ تو اس قسم کی عبارت پڑھ کر پھر اس کا دماغ تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ لکھتے ہیں:۔

سعیدہ:۔ "نانی اماں وہی دینا جس کے ہاں سے ہمارا اناج آتا ہے۔"

احمد:۔ "نانی اماں دنیا۔ پودینہ۔ باجرے کی روٹی ٹکا جینہ۔"

حمیدہ:۔ "نانی اماں! وہ کہاوت ہے دگلوس سے اگلا۔"

نانی:۔ "دگلوس سے اگلا۔ پہنو تو گرم بچھاؤ تو نرم باندھو تو بقچی کا بھرم۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسے الفاظ لکھنے سے عبارت مشکل نہیں ہوتی۔ بلکہ عبارت میں ایک اور خاص رنگ کا اضافہ ہو جاتا ہے جس کو مرزا صاحب نے اختیار کر کے اردو زبان کے بڑے بڑے ادیبوں کو مات کر دیا۔

غرض آپ کی تحریر میں وہ تمام خوبیاں مجموعی طور پر پائی جاتی ہیں جو دوسرے ادیبوں میں علیحدہ علیحدہ پائی جاتی ہیں۔ اسلئے پڑھنے والا ہر قسم کا اور اپنے مذاق کے مطابق لطف اٹھا سکتا ہے۔

اُس کے الفائے عہد تک نہ جیئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی!
(میر)

مجھے تو رشک آتا ہے غم جاناں کی ہستی پر
بدل لے کاش اپنی زندگی سے زندگی میری!
(جگر)

اختر وہاب طلعت
(ملتان)

سیاہ حلقے

نیلے گگن کے دامن میں کئی موتی ٹکے تھے ــــ بادلوں کے سفید سفید خوبصورت ٹکڑے دُور تک ۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں آوارہ پرندوں کی طرح اڑ رہے تھے ــــ جگمگاتے ہوئے تارے رات بھر کی مسرتیں اور فرحتیں سمیٹ کر تھکن کی نیند سوتے جا رہے تھے ــــ رات کی سیاہ دیوی اپنی سیاہ زلفیں سمیٹ رہی تھی ــــ تاریکیوں کے دھندلکے بکھر کر اجالے کی بانہوں میں چُھپ رہے تھے ــــ غالباً سورج اپنی منزل پر کمربستہ ہونے کے لئے پر تول رہا ہوگا ــــ بولان میل آدھ گھنٹہ گزار کر روہڑی پہنچی تھی ــــ پشاور اور لاہور کے ڈبوں کو حسبِ معمول سائیڈ لگ پر لے لیا گیا تھا ــــ جنہیں کراچی سے آنے والی "خیبر میل" کے ساتھ لگنا تھا میل کی آمد میں دو گھنٹے رہتے تھے ــــ نیم تاریکی میں ریلوے سٹیشن پر بجلی قمقمے جا بجا نور کی کرنیں بکھیر رہے تھے ــــ الیاس اپنے کمپارٹمنٹ کو چھوڑ کر پانی کے چھوٹے ٹب کی منڈیر پر بیٹھ گیا ــــ آج وہ ڈیڑھ سال کے بعد کوئٹہ ایسی جگہ چھوڑ رہا تھا ــــ اس کی زندگی کی ندی طرح طرح متلاطم لہروں سے بھرپور تھی ــــ آئندہ زندگی کی راحتیں اور شادمانیاں ــــ وہ خوش تھا ــــ لیکن ؟ ــــ ماضی ! ــــ اور وہیں وہ اپنے مستقبل کا ماضی سے مقابلہ کرنے بیٹھ گیا ــــ سیمنٹ کے بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھا وہ ماضی کے بحرِ بیکراں کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن تھا ــــ آج وہ ماضی کی بے ترتیب کتاب کے ورق الٹ رہا تھا !

الیاس نے بمبئی کے ایک متوسط گھرانے میں جنم لیا ــــ بچپن ہی میں کافی شریر اور منچلا تھا ــــ پانچ سال کا ہوا تو اس نے گلی کوچوں کے آوارہ بچوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا ــ کبھی گھر نہ ٹکتا ۔ گھر سے چیزیں لے جا کر اپنے ساتھیوں میں بانٹ دیتا ــــ اگر کوئی دوست بغیر نیکر پہنے نظر آتا تو فوراً "وارڈ روب" میں گھس کر اپنی نئی نیکر نکالتا اور اسے پہنا آتا ــــ والدین سخت پریشان تھے ــــ مگر "اکلوتا بچہ" اس کا شیشے ایسا نازک دل نہ توڑ سکتے تھے ــــ باپ اسے "چور" کہا کرتا ــــ گھر والے ہمیشہ اسے لعن طعن کرتے ــــ اس کا معصوم دل بہت حساس تھا والدین کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد وہ باغیچے میں نکل آتا ۔ یہاں اسے کسی کنجِ تنہائی کی تلاش ہوتی ــــ گھنٹوں والدین کے اس رویّے پر آنسو بہاتا ــــ ایک دن باپ نے کسی بات پر پیٹا بھی ــــ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور آئے دن کی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ بالآخر کسی سے کچھ کہے بغیر گھر سے نکل بھاگا ــــ اسے جلد ہی ایک ایسی پارٹی سے واسطہ پڑا جو بچوں کو آلۂ کار بنا کر چوریاں کرواتی ــــ اور جیبیں کٹواتی تھی ــــ الیاس ان کے ہاتھ لگ گیا ــــ وہ اسے پنجاب کے بارونق شہر لاہور میں لے آئے ــــ کچھ دن بعد وہ ٹیم بھی قانون کی زد سے نہ بچ سکی ــــ اور الیاس کو پھر تنہا پھرنا پڑا ــــ اس اثنا میں وہ روزانہ ایک معمولی ہوٹل کے دوکاندار کو پانی بھر دیتا ــــ اس کے عوض سے دو تین آنے مل جاتے اور ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر بغیر کسی بچھونے کے رات گزر جاتی ــــ ایک رات وہ میٹھی نیند سویا ہوا تھا کہ ــــ ایک اجنبی کے پاؤں اس کے جسم سے ٹکرائے ــــ اجنبی کوئی سیٹھ معلوم ہوتا تھا ــــ الیاس کراہ رہا تھا ــــ سیٹھ نے ٹارچ کی روشنی میں جب ایک چھ سالہ بچے کو یوں بھٹکتے دیکھا

تو ہمدردی کے جذبات آنکھوں کے راستے اُمڈ آئے ــــ

"بیٹے! کون ہو؟" انہوں نے دریافت کی ــــ "بیٹے!" یہ لفظ سُنتے ہی اس کا گلہ رندھ گیا۔ آج اسے کتنی مدت کے بعد کسی نے بیٹا کہا تھا ــــ اس کا پراسرار دماغ بہت کچھ سوچ رہا تھا ــ اسے اپنے "ابا" یاد آگئے ــ جو اسے پیار سے "بیٹا الّی" اور غصے میں "ابے الو" کہا کرتے۔ اس کے آنسو نکل آئے۔ اس نے رقت آمیز آواز میں تمام واقعات سیٹھ صاحب کو سُنا دیئے ــــ سیٹھ کے ہاں کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اور یہ سب کچھ سُن کر ان کا دل پسیج گیا ــــ!

"بیٹا! تم میرے ساتھ چلوگے!" سیٹھ نے کہا اور بیٹی کو چمکارنے لگا "ننھی دیکھو یہ تمہارا ساتھی ہے۔ کتنا اچھا ہے یہ" اور وہ اسے ساتھ لئے گھر آگئے ــــ نوکر نے اسے نہلا دھلا کر اچھے اچھے کپڑے پہنائے ــــ ننھی مینا کی والدہ بھی اسے یوں اکیلا باپ کے پاس چھوڑ کر چل بسی تھیں!

وہ اس ماحول میں ایک گھر کا حقیقی فرد بن کر رہنے لگا ــ سیٹھ صاحب جنہیں وہ مینا کی طرح ڈیڈی کہنے لگا اسے بہت پیار کرتے ــــ اسکول جانے لگا ــــ رفتہ رفتہ ترقی کرنے لگا ــــ والدین کی یاد کچھ کچھ بھول چکی تھی ــــ اب اسے ایک مہربان کی شفقت کا سایہ میسر ہوا ــــ مینا اس سے کبھی نہ لڑتی

دن گذرتے گئے سالوں پر سال چڑھتے گئے ــــ اور اب اس نے میٹرک پاس کرلی تھی۔ اچھی ڈویژن پر ــ ڈیڈی کتنے خوش تھے آج۔ انہوں نے غریب بچوں میں مٹھائی تقسیم کی۔ دوستوں کو دعوتیں دیں ــ میٹرک پاس کرنے کے فوراً بعد ملکی تقسیم کے جھگڑے نے سر اٹھایا ــــ ہر طرف فسادات ہوتے نظر آنے لگے ــــ پارٹیشن ہوگئی ــــ ہندوستان اور پاکستان دو علیحدہ علیحدہ خودمختار سلطنتیں بنادی گئیں ــــ کچھ دن یہ گہما گہمی رہی ــــ اور اب پھر مکمل امن و امان تھا۔ اس نے باقاعدہ طور پر کالج لائف شروع کرلی ــــ کالج کی رنگین فضا میں وہ قدم رکھ چکا تھا ــــ بیتے لمحے مرے ہوئے کیڑے تھے ــــ اپنی کلائی پر پڑے ہوئے سیاہ حلقے کو دیکھ کر پرانی یادیں اس کے دماغ میں چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگتیں ــــ ایک دفعہ اس کے ابا اپنی "بائیک" پر اسے گھمانے جارہے تھے ــــ ایک تانگے سے ٹکر ہوگئی ــــ اور الیاس کی کلائی کے گرد جلنے سے حلقے بن گئے ــــ موٹرسائیکل کے نیچے وہ تھا ــ اور ادھر ابا ــــ اور ابا کے اُوپر تانگے کا بوجھ ــــ لیکن اس کے ابا نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بچا لیا ــــ اور جب اس کے ابا ان سیاہ حلقوں کو دیکھتے تو پریشان ہوجاتے۔ الیاس کو اپنی باہوں میں بھینچ کر کہتے ــــ "الّی بیٹے! اس دن مَیں نے تمہیں موت کے مُنہ سے بڑی دلیری سے چھینا تھا۔ تمہاری کلائی کے یہ نقوش مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے ــــ یہ حلقے میرے دماغ کے گرد ہمیشہ چکر لگاتے رہیں گے۔ کتنے اچھے تھے وہ دن ــــ وہ اُداس رہتا ــــ مینا اس سے پوچھتی مگر ایک دُکھتی مسکراہٹ کے ساتھ ٹال جاتا ــــ "نہیں نہیں! کچھ بھی نہیں!" وہ اپنے باپ کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ بچپن میں صرف اسے ابا ہی کہنا سکھلایا گیا تھا ــــ وہ سوچ میں ڈوبا رہتا ــــ تصور کے تانے بانے بُنتا ــــ خیال کے جھروکوں میں بیٹھ کر ماضی کے دھندلکوں میں جھانکتا ــــ سیٹھ اس کے چہرے کو کبھی نہ پڑھ پاتا ــــ اس کی نگاہ کبھی اس کی اداسی کا کھوج نہ لگا سکی ــــ! کنج عزلت کا شیدائی کبھی شورشِ محفل کا دلدادہ بن بیٹھا ــــ جیسے لق ودق صحرا سے کوئی سودائی دیوانہ چلا آیا ہو ــــ مگر اسے اپنے درد کا علاج نہ ملا ــــ وہ سوچ میں ڈوبا رہتا۔ آخرکار کمزور ہوگیا ــــ کھانسی ہوئی بخار گھیرے رہتا۔ اور ہر وقت افسردہ اور تنہا رہتا! ــــ سیٹھ صاحب کو اس کی فکر تھی۔ انہوں نے اسے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ اور اس کے ساتھ ان کی زندگی کی کئی آرزوئیں وابستہ تھیں۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر کڑھتے۔ جوں توں کرکے الیاس نے "ڈگری" لے لی ــ اور سیٹھ صاحب کے اصرار پر ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا ــــ مگر پریشانیاں اس کا پیچھا نہ چھوڑ سکیں۔ تفکرات اس کے نازک دماغ کو

دیمک کی طرح چاٹتے رہے ـــــ ایم۔اے کے بعد سیٹھ صاحب نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیج دیا۔

الیاس کی اچانک گمشدگی سے اس کے والدین کے دل پر جو گزری اس کا ذکر بیان سے باہر ہے ـــــ انہوں نے ہر طرح تلاش کرنے کی کوشش کی ـــــ لیکن سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں ـــــ ایک دو سال گزرنے کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ ان کا فرزندِ ارجمند اس دُنیا میں نہیں ـــــ جوان بیٹا ہو تو والدین کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ ان کا سکون اُٹھ جاتا ہے ـــــ مگر کم سن بچے کا اس طرح چھینا جانا والدین کو شاید اتنا پریشان نہ کرتا ہو ـــــ باپ اب بیٹے کا غم بھول چکا تھا لیکن ماں اور بہنیں اپنے "منّے" "اِلّی" کی یاد میں بے قرار رہتی تھیں۔ الیاس کی بہن رضیہ بسترِ مرگ پر پڑی اپنے روٹھے ہوئے بھائی کو یاد کر رہی تھی ـــــ اس کی آنکھیں ننھے کے انتظار میں دروازے پر لگی رہیں اور وہ بھی انہیں داغِ مفارقت دے گئی ـــــ کتنا سنجیدہ تھا یہ موت کی دیوی کا مذاق ـــــ!

الیاس کو گم ہوئے پندرہ سال ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں تقسیم کا سوال آن ٹپکا ـــــ ہر طرف خونریزیاں ہونے لگیں ـــــ ہندو، سکھ مسلمانوں کی جان کے لاگو ہو گئے ـــــ کشتوں کے پشتے لگ گئے ـــــ اور پھر تقسیم ہو گئی ـــــ الیاس کے ابا کو بمبئی چھوڑنا پڑی، جان ہتھیلی پر رکھے وہ لاہور پہنچ گئے ـــــ یہاں آکر کچھ دن اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے ـــــ مگر سر چھپانے کو ایک کھولی نہ مل سکی ـــــ بے روزگاری نے اڈے جما لئے ـــــ چند دنوں میں الیاس کی ماں بھی انتقال کر گئیں ـــــ!

انگلینڈ سے واپسی الیاس کو لاہور ہی میں ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ اس کی تمام اُمیدیں پوری ہونے والی تھیں مگر ـــــ اب بھی صحت اچھی نہ تھی ـــــ وہ سیٹھ صاحب کو بہت پیارا تھا۔ اُسے اب انہوں نے زمین سے اُٹھا کر آسمان کی لا انتہا وسعتوں میں لا بٹھایا تھا ـــــ پتھر سے ہیرا بنا دیا تھا۔ اب ان کا خیال کہ حقیقت میں الیاس مینا کا بہترین ساتھی بن سکے گا ـــــ اور یہ سب کچھ ثابت ہو چکا تھا ـــــ بیماری کا پتہ نہ چلتا تھا ـــــ علاج ہوتا رہا مگر ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ تپدق تشخیص ہوا ـــــ!

ماہر ڈاکٹروں کی رائے پر ایکسرے ہوئے۔ سیٹھ صاحب نے اُسے علاج کے لئے کوئٹہ سینی ٹوریم بھیج دیا ـــــ!

وہاں ایک مدت گزارنے کے بعد اب وہ نہ صرف تندرست تھا بلکہ قابلِ رشک حد تک توانا بھی ـــــ اس کا چہرہ خون سے سُرخ اور جسم گوشت سے بھرا ہوا تھا ـــــ یہ بیماری اُسے حقیقی شباب دے گئی ـــــ وہاں اس نے ہر مریض سے اتحاد و اتفاق کا سبق سیکھا تھا۔ سب آپس میں بھائی بھائی تھے۔ امیر غریب کا سوال تک نہ تھا ـــــ خاص کر مسٹر جعفری کی محبت اُسے نہ بھول سکی ـــــ وہ ان کا بے حد ممنون تھا۔ اُن کی مسکراہٹ اور خندہ جبینی پر قربان ہوا جاتا تھا ـــــ اس نئے ماحول میں وہ سب غم بھول گیا ـــــ اب اس کی زندگی ایک خندہ زن پھول تھی جس پر سے خزاں کی ساعتیں گزر چکی ہوں۔ دوسروں کے حسنِ سلوک سے اس کا متاثر دل بہت ہی خوش تھا۔ اس کا دل ایک آئینہ تھا جس میں دوسروں کی صداقت نظر آجاتی۔ اور اس روشنی سے اس کے من کی تاریکیاں ہمیشہ کے لئے چھٹ گئیں ـــــ اسے اب ہر اعتبار سے تندرست ہونے پر بھیجا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے ڈیڈی کو چٹھی لکھ دی تھی کہ الیاس اب اس قابل ہے کہ اس کی شادی کسی تندرست خاتون کے ساتھ کر دی جائے ـــــ تاکہ وہ اس کی ڈگمگاتی زندگی کو سنبھال لے۔ اور اب وہ کل شام چار بجے میل پر روانہ ہوا تھا ـــــ ان لوگوں سے متاثر ہو کر یہ ہوٹل چھوڑتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ گویا وہ اپنا گھر بار چھوڑ رہا ہے ـــــ

افق پر سورج کی سنہری کرنیں دھیرے دھیرے پھیل رہی تھیں ـــــ دریائے سندھ کا پانی ساحل سے ٹکرا کر ٹھاٹھیں مار رہا

تھا ـــــ دن کا شہزادہ اپنی قبا لہرا رہا تھا ـــــ خیبر میل آ گئی۔ کٹے ہوئے ڈبے لگا دیئے گئے۔ اس کا کمپارٹمنٹ انجن کے قریب دو بوگیاں چھوڑ کر تھا ـــــ اور آخر کار ساڑھے سات بجے ٹرین چل دی۔ وہ سیکنڈ کلاس کے اکیلے ڈبے میں سیٹ پر نیم دراز تھا ـــــ اب وہ چمن کی اس بلبل کی طرح نہ تھا جس کی طرزِ فغاں چمن والوں نے لوٹ لی ہو۔ اس کا طائرِ تخیل فلک بوس بادلوں سے سرگوشیاں کر رہا تھا ـــــ دن ڈھلتا گیا، سائے کودے اور پھسلتے گئے ـــ ملتان، خانیوال گزر گئے تھے ـــــ وہاں اس کے دوستوں نے اس سے سٹیشن پر ملاقات کی تھی ـــــ سورج کا مسافر مشرق کی گھاٹیوں میں آرام کی خاطر روپوش ہو رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی ـــــ لاہور کوئی اتنا دور نہ تھا۔ اب منٹگمری، اوکاڑہ اور پھر بس لاہور ـــــ! اس کی منزل سامنے تھی ـــــ اپنے ڈیڈی کا مسکراتا چہرہ اسکی نظروں کے سامنے رقص کر رہا تھا ـــــ اس نے ہاتھ منہ دھوئے، اپنا بہترین لباس زیبِ تن کیا اور ہاتھ روم کے آئینہ میں چہرے کی معصومیت میں کھو گیا ـــــ سفید قمیص اور سیاہ پتلون اس کے جسم پہ کتنی پھب رہی تھی ـــــ دھاری دار نیلی ٹائی میں گرہ دیکر وہ باہر کے دروازے میں کھڑا ہو کر بیرونی نظاروں سے لطف اندوز ہونے لگا ـــــ الیکٹرک انجن پوری رفتار سے چنگھاڑ چنگھاڑ کر راستہ طے کر رہا تھا ـــــ گاڑی زمین کو روندتی ہوئی جا رہی تھی ـــــ گجمبر کا سٹیشن آنیوالا تھا ـــــ الیاس نے دروازے میں کھڑے سگنل پر نگاہیں گاڑھ دیں ـــــ سبز روشنی کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ ـــــ سٹیشن قریب ـــــ وہ سوچ میں محو ہو گیا ـــــ دفعتاً ایک کڑک پیدا ہوئی ـــــ جیسے ایٹم بم پھٹ گیا ہو۔ دھماکا لگنے سے وہ گاڑی باہر نو فٹ پرے پتھریلی پر جا گرا تھا۔ گاڑی کا ایکسیڈنٹ ـــــ یہ حادثہ بہت دردناک تھا ـــــ اگلے ڈبے بالکل "پریس" ہو گئے تھے ـــــ لیکن چونکہ الیاس دروازے میں کھڑا تھا۔ دھماکے اور دباؤ کی قوت نے اسے باہر فضا میں اچھال دیا۔ بالکل ایک کوکونٹ گیند کی مانند جو باؤنڈری کی سرحد پار کر چکی ہو ـــــ گاڑیوں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ دونوں انجن تباہ ہو گئے تھے۔ عورتوں کی واویلا ـــــ بچوں کی چیخ و پکار ـــــ اور زخمیوں اور جلنے والوں کی آہ و فغاں سے پتھر دل موم ہوئے جا رہے تھے ـــــ کچھ لٹیرے لوٹ مار میں مصروف ہو گئے۔ الیاس لائن سے تھوڑا دور پڑا تھا ـــــ ایک لٹیرے نے اسے دیکھا ـــــ الیاس کی کلائی پہ رولکس کی نئی رسٹ واچ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں ـــــ اس نے جھپٹ کر کلائی پکڑی اور خوبصورت چین کھولنا شروع کر دیا ـــــ گھڑی کھولتے ہوئے اس کی نظریں الیاس کی کلائی پہ پڑے ہوئے حلقوں پہ پڑیں ـــــ اور نظریں جم گئیں ـــــ الیاس کسی کا لمس محسوس کر کے بے ہوشی کی حالت میں ہی "پانی! پانی!" کہنے لگا ـــــ بوڑھے لٹیرے نے فوراً ایک جگہ سے پانی لا کر اس کے ہونٹوں پر ٹپکایا ـــــ مگر الیاس بے ہوش ہو چکا تھا ـــــ پولیس اور ہسپتال کی ایمبولنس کار زخمیوں کو ہسپتال لے جا رہی تھی ـــــ وہ بوڑھا لٹیرا بھی ساتھ تھا ـــــ!

الیاس بے ہوش تھا ـــــ دو روز کی بے ہوشی پر سبھی حراساں تھے ـــــ الیاس کی جیب سے سیٹھ صاحب کا خط برآمد ہوا تھا ـــــ انہیں بلوا لیا گیا ـــــ زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا۔ اپریشن روم میں ـــــ الیاس لٹریچر پڑھ رہا تھا ـــــ زندگی کی امید کم تھی ـــــ ڈاکٹر خون کی کمی بتلا رہا تھا۔ لیکن سیٹھ صاحب اور وہاں دوسرے سب آدمیوں کا خون ٹسٹ کیا گیا ـــــ لیکن ان کا خون اس میں استعمال نہ ہو سکتا تھا ـــــ سیٹھ صاحب نے الیاس کہہ کر پکارا ـــــ تو بوڑھا لٹیرا چونک پڑا۔ اس نے قریب آ کر دوبارہ الیاس کی کلائی دیکھی اور رو رو کر چلانے لگا ـــــ "ڈاکٹر! جس قدر بھی خون درکار ہو ـــــ میں دینے کو تیار ہوں ـــــ میری عمر پچاس سال سہی مگر میرے رگوں میں ابھی جوانی کا خون دوڑ رہا ہے ـــــ ڈاکٹر کسی طرح الیاس کو بچا لو! ـــــ بچا لو ڈاکٹر میرے بیٹے کو ـــــ اس ظالم موت سے ـــــ الیاس میرا حقیقی بیٹا ہے ـــــ یہ میرا خون ہے ـــــ

میرے اور اس کے خون میں کوئی فرق نہیں ـــــ" بوڑھے کی سسکیاں رہ رہ کر ابھر رہی تھیں ـــــ ڈاکٹر بوڑھے کے چہرے پر نگاہیں جمائے تھا ـــــ جو ابھی تک کافی تندرست اور ہٹا کٹا تھا۔ بھوری داڑھی میں اس کا سرخ بارعب چہرہ ـــــ اب غم ویاس میں ڈوب رہا تھا ـــــ ڈاکٹر نے خون ٹسٹ کیا ـــــ بوڑھے کا کہنا درست تھا ـــــ خون بالکل ایک ہی تھا ـــــ اپریشن کیا گیا ـــــ اور الیاس کی جان بچ گئی اور اب وہ تندرست تھا ـــــ

اور اب وہ بوڑھے کے سینے پر اپنا سر رکھے آہستہ آہستہ سسکیاں لے کر رو رہا تھا ـــــ اسے تمام حالات کا علم ہو چکا تھا ـــــ حالات نے اسے مجبور کر کے ـــــ جیب کترا ـــــ چور اور لٹیرا بنا دیا تھا ـــــ اور آج کل گمیبر کے چھوٹے سے سٹیشن میں قسمت آزما رہا تھا ـــــ وہ کہہ رہا تھا "بیٹا! عمرِ گزشتہ کی یاد بڑھاپے میں سوہانِ رُوح ہوتی ہے۔ کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے ـــــ اور اب جب بیتے لمحے میرے دل کو یاد آ کر جھنجھوڑتے ہیں تو مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو جاتی ہے ـــــ الیاس باپ کو لاہور لایا ـــــ انتھک کوششوں سے بوڑھے کی جان بچی ـــــ!!

الیاس کی لاہور میں شادی ہو رہی تھی ـــــ بڑی دھوم دھام سے ـــــ آج اس کے ابا اور سیٹھ صاحب ـــــ دونوں بہت خوش تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی زندگی کی کشتی کیسے ہولناک ہچکولے کھانے کے بعد ساحلِ مراد پر پہنچی ہے۔۔

ایک خفیف سے حادثے نے اس کی باقی زندگی کو کتنا رنگین کر دیا ہے ـــــ! خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا ـــــ اس کی نگاہ بار بار اس سیاہ حلقے پر پڑ رہی تھی ـــــ جس نے دو بچھڑے ہوئے دلوں کو ملا دیا تھا!!!!

"سچے دوست کا ملنا مشکل ہے: تاہم ایک ایسا شخص ہونا چاہیئے، جو جذبات کو سنتا رہے۔"

(بیکن)

لطف الرحمٰن محمودؔ

(سائنس)

غزل

دامن ہیں تہی دولتِ اخلاص و وفا سے
اِس دَور کا ہر پیر و جواں دیکھ لیا ہے

اِک خار ہے پھولوں کے تبسّم کی ردا میں
کہتے ہیں جسے "حُسنِ بُتاں" دیکھ لیا ہے

اِس موسمِ گُل میں بھی کبھی سینۂ گُل سے
اُٹھتا ہُوا آنکھوں سے دھُواں دیکھ لیا ہے

واعظ نہ بتا مجھ کو کہ اِس دَورِ زبوں میں
یہ معرکۂ سُود و زیاں دیکھ لیا ہے

پھُولوں کے تبسّم سے ستاروں کے جہاں تک
ہر شے سے ترا حُسن عیاں دیکھ لیا ہے

اب کلمۂ حق کا بھی اثر وقت کے دل پہ
کس درجہ گزرتا ہے گراں دیکھ لیا ہے

محفوظ رہی دار پہ بھی حُسن کی تقدیس
محمودؔ کا اندازِ فغاں دیکھ لیا ہے

منظور احمد شاکر
(سوہن)

پنجابی زبان کا ایک قادر الکلام شاعر

فارسی زبان میں ایک ضرب المثل ہے "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" یعنی ہر پھول کی خوشبو مختلف ہوتی ہے بعینہ اسی طرح ہر زبان میں ہر شاعر کی شاعرانہ عظمت اور خوبی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے ؎

اس چمن کو زیب ہے اختلاف

کئی شعراء محض ایک شعر کی وجہ سے جی رہے ہیں۔ بعض ایک ایک رباعی کی بدولت زندہ ہیں۔ لیکن تھوڑے ہیں جو اپنے مجموعی کلام کی وجہ سے بقائے دوام حاصل کئے ہوئے ہیں اور ہمیشہ کے لئے آسمانِ شہرت پر تابندہ و درخشندہ ہیں!

اُردو زبان میں طرح طرح کے شعراء گزرے ہیں لیکن غالب کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ غالب خود فرماتے ہیں ؎

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

یہی حال فارسی زبان کا ہے۔ اس میں ہزاروں شعراء مثلاً رودکی، فرخی، منوچہری، عنصری، قاآنی، سعدی، امیر خسرو، نظیری، عمر خیام، مولانا روم اور جامی وغیرہ گزرے ہیں لیکن جو درجہ حافظ شیرازی کا ہے وہ دوسرے کو نصیب نہیں ہو سکا۔ اسی طرح انگریزی زبان کو شیکسپیئر پر ناز ہے۔

ان زبانوں کی طرح ہماری پنجابی میں بہت قادر الکلام اور مایۂ ناز شعراء گزرے ہیں۔ مثلاً وارث شاہ کو پنجابی کا شیکسپیئر تسلیم کیا گیا ہے۔ سید فضل شاہ کو انگریزی عہدِ حکومت میں "ملک الشعراء" کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میاں محمد بخش کی شاعری کا لوہا تمام پنجابی شعراء نے مانا ہے۔ اُن کی مشہور و معروف تصنیف "سیف الملوک" پنجابی زبان میں مثنوی کا درجہ رکھتی ہے۔

میاں محمد بخش ضلع جہلم کے ایک مشہور و معروف گاؤں گڑھی ملک میں پیدا ہوئے۔ ۳۲ سال کی عمر میں انہوں نے یہ تصنیف ۱۲۱۹ھ ہجری میں پایۂ تکمیل کو پہنچائی۔

تمام قصہ سیف الملوک مولوی نظامی گنجوی کے اس شعر کی تشریح میں لکھا گیا ہے ؎

چنیں زد مثل شاہ گویندگاں
کہ یابندگانند جویندگاں

ترجمہ۔ سب سے بڑا اصول یہ بتایا گیا ہے کہ جستجو کرنے والا پانے والا ہوتا ہے۔"

یہ تمام قصہ فردوسی کے شاہنامہ کی طرز پر مثنوی کے رُوپ میں لکھا گیا ہے۔ آپ واقعی کوزے میں دریا کو بند کر دیا ہے۔

آپ کی شاعری کی چند چیدہ چیدہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:۔

اوّل:۔ سب سے بڑی خوبی آپ کی شاعری میں یہ ہے کہ بعض اوقات آپ کے اشعار اُردو کے اتنے قریب آجاتے ہیں کہ اُردو عبارت اور پنجابی عبارت میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب بدیع الجمال (جو اس قصہ میں (Heroine) ہیروئن ہے۔) شہزادہ سیف الملوک (جو اس قصہ میں (Hero)

ہیرو ہیں) کی باغ میں زیارت کرتی ہے۔ اِس منظر کو میاں صاحب نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

(۱) سبزہ پہن پوشاک خضروی ہویا ہریا بھریا
پھُل گلاب دے وانگوں ہو کے پیر تخت تے دھریا
نرگس مست محبت کیتا شاہ پری دیاں نیناں
غرض کرے سر کڈھ شگوفے ٹیبھی درشن لیناں
ہتھ کھلار چنار کھلوتے زاہد یار کنارے
کرن دُعائیں مولا سائیں پری وکھائے یارے
سوہا مکھ کشادہ کر کے بن تن دُھوپ اُجالا
دِل دا داغ وچھوڑے والا کھول دسے گُل لالہ
کھلے کیلے جھُلن لگے ویکھ پری مستانی
آکھے ویکھ حُسن میں جیواں جان کراں قربانی
اُٹھ اُٹھ بلدی شاخ چنبے دی جیوں گھر دوول چیلا
گُل عباسی مار اُداسی کہے نقشے داویلا

دوم:- شاہ پری کی جُدائی آپ سیف الملوک کی قلبی واردات کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

(۱) باغ بہاراں تے گلزاراں بن یاراں کس کاری
یار ملن دُکھ جان ہزاراں شکر کراں لکھ واری
(۲) اُچی جائی نیوں لگایا بنی مصیبت بھاری
یاراں باہجھ محمد بخشا کون کرے غمخواری
(۳) سورج دی آشنائیوں کی کُجھ لدھا نیلوفر نوں
اُڈ اُڈ موئے چکور محمد سار نہ یار قمر نوں
(۴) لمی رات وچھوڑے والی عاشق دُکھیے بھانے
قیمت جانن نین اساڈے مُکھیا قدر کی جانے
(۵) درد فراق تیرے دا مینوں تاپ ہے نت چڑھیا
شربت تیرا نام محمد پیتا جاں جی سڑیا

نظامی گنجوی نے جو "زاری کردن در فراق خسرو پرویز" کے عنوان کے ماتحت شریں کے واردات قلبی کو بیان کیا ہے۔ وہ اشعار اس پنجابی شاعر کا مقابلہ نہیں کر سکتے ؎

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اَور

سوم:- مولانا بے ثباتی دُنیا کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچتے ہیں ؎

(۱) مان نہ کیجے دُھوپ گھنے دا وارث کون حُسن دا
سدا نہ رہسن ایہہ شاخاں ہریاں سدا نہ پھُل چمن دا
(۲) سدا نہیں ہتھ مہندی رتے سدا نہ چھنکن ونگاں
سدا نہ چھوپے پا محمد رل مل بہناں سنگاں

چہارم:- نسلی تفریق کو یوں حل کرتے ہیں ؎

کون کہے ناجنس انہاں نوں اکو ماپیو جائے
اِکو ذات انہاں دی تو ڑ دل اکوں رنگ وٹائے
اِک کالے اِک سبز کبوتر اِک چٹے بن آئے
چٹے کالے رلن محمد نہ بن بہن پرائے

پنجم:- حافظ شیرازی انسان کے ظلوماً جہولاً کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

بارِ امانت آسماں نتوانست کشید
قرعہ آں بنامِ من دیوانہ زدند

اِس مفہوم کو دیکھیے مولانا کس طرح ادا کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں ؎

آکھ بُلا بُلا سہیرہی انسانے نادانے

مولانا الطاف حسین حالی انسان کے احسنِ تقویم ہونے کے بارے میں فرماتے ہیں :-

فرشتہ سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

دیکھیے میاں محمد بخش اسی مفہوم کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

قدر انسان جوان بھلے دا ملکاں تائوں اگے
کھول نہیں ایہہ گل محمد مت کوئی جھگڑا لگے

محمد اکرام خان
(فنون)

پند لمیرے جیون دے....

جس پیار دی دُنیا ویکھی نہ
او آس لگانی کی جانے
جس دل دے اندر وسدے نے
او یاد بھلانی کی جانے
اَج منان دے اندر وسدے نے
مَیں پریت انہاں نوں کرداہاں
جو بھر اکھیاں نہ ویکھ سکے
او درد ونڈالنے کی جانے
پند لمیرے جیون دے سُن
مَیں اُدھ وچالے بُھل بیٹھا
جو راہ دے قاتل بن بیٹھے
او راہ وکھانے کی جانے
کوئی ہوش دلاں نوں رہندی نہ
جد یاد اُنہاں دی آجاندی
جو ہستی ہے مدہوشی دی
او ہوش دیوانی کیا جانے

منظور احمد شاکر
(فنون)

غ

مَیں وہ دل ہوں جو تڑپایا گیا ہوں
جھلک دکھلا کے للچایا گیا ہوں

لُٹی ہے میرے ارمانوں کی دُنیا
چمن میں جب سے مرجھایا گیا ہوں

"فضائے کوئے ہمدم میں اے لوگو!
مَیں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں"

اُسی محفل کا رہتا ہے تصوّر
کہ جس محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

میری حالت پہ شاکرؔ مسکرامت
مَیں وہ سر ہوں جو ٹھکرایا گیا ہوں

AL-MANAR

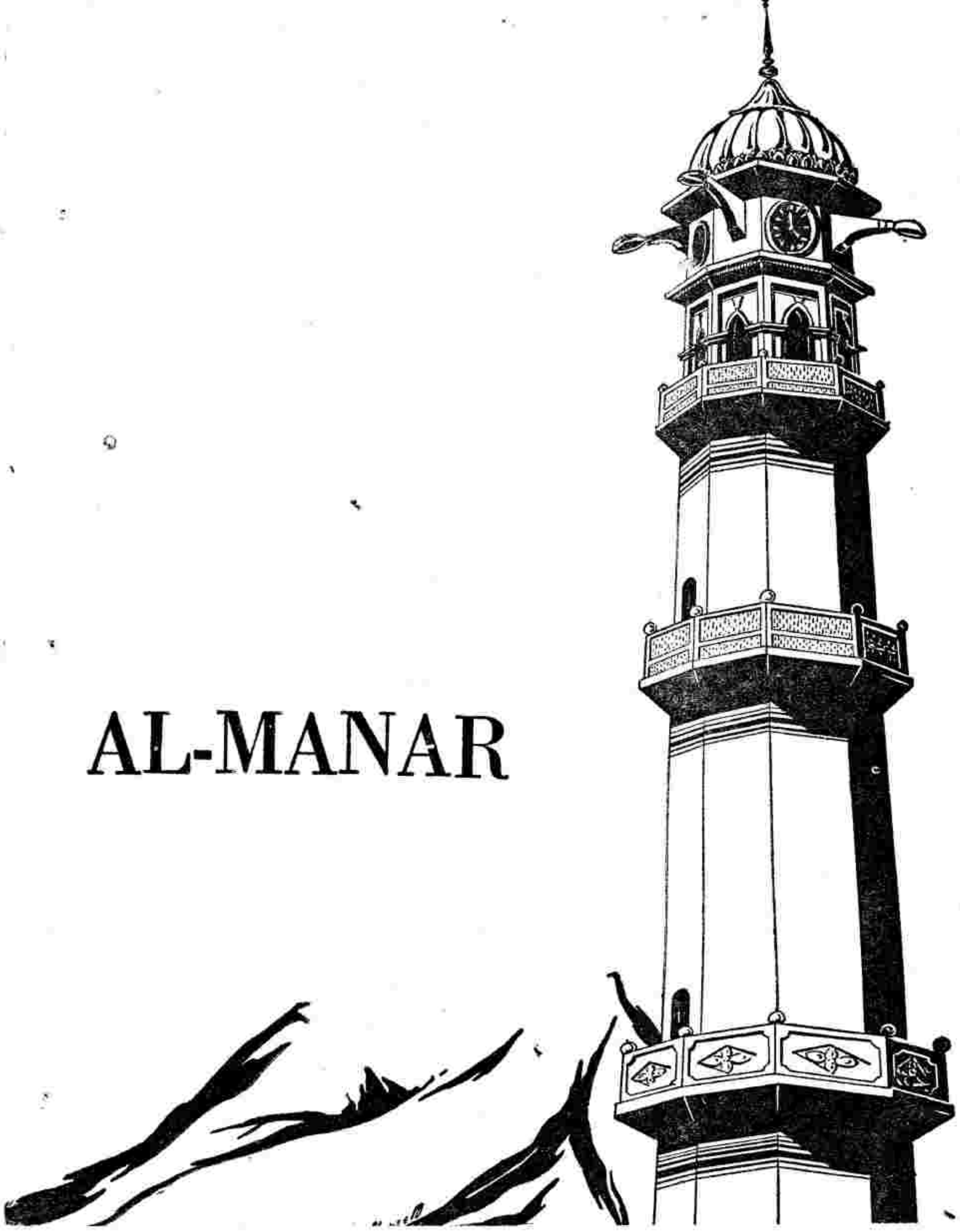

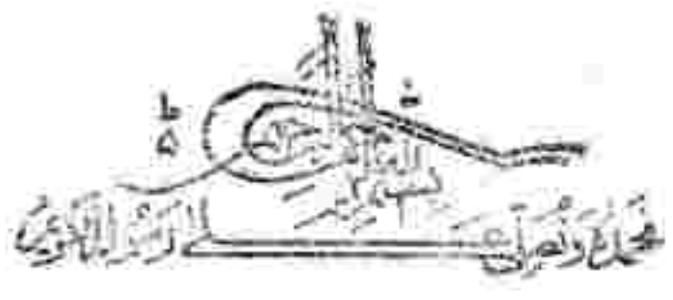

AL-MANAR

ORGAN

OF

Talim-ul-Islam College

RABWAH

★

March - April, 1959

★

Professor-in-Charge
SAEED A. RAHMANI M.A.

Editor-in-Chief
RASHID AHMAD

Editors
SALEEM A. SIDDIQUI
ABDULLAH ABU BAKAR

CONTENTS

				Page
1.	Editorial		...	1
2.	The New Testament—Vs—The Koran :	S.A.M.	...	3
3.	Poem	Zafar Mahmood	...	7
4.	Wordsworth and Nature	Salim A. Siddiqui	...	9
5.	Some Mathematical Tricks	Abdur Rahman Nasir	...	12
6.	Mr. Malaprop	ABAB	...	14
7.	The Sacred Wine	L. Rahman Khan	...	15
8.	Old Familiar Faces	Ijazurrehman	...	16

Printed by S. A. Rashid, Managing Proprietor, The Lion Press, Hospital Road, Lahore
and published by A. R. Junaid Hashmi, from Talim-ul-Islam College, Rabwah, West Pakistan
Prof. Incharge : M. A. Choudhri

Editorial

True, criticism is a whetstone that makes keen the blunt edge of our literary genius and fashions it into a sheeny, smooth thing that delights all who care to touch it or use it, but if by criticism we only mean to hush the antagonistic promptings that we nurse against our literary adversaries, and having done so we derive devilish delight, it tends to become a sort of mud-slinging affair that has delight only for urchins, not for grown-ups.

We don't want to comment editorially an the articles published in the last issue, yet we would like to express a few thoughts on criticism. These reflections are not meant to convey the true sense of what criticism is. Yet they would guide a beginner, going to criticise *Al-Manar*. Criticism to help the writer know his shortcomings so that he may make amends in future.

This is about ourselves who are to *Al-Manar* as editors. We request the lash of criticism should not fall on an individual exponent and interpreter of a distinct school of thought, but it should, on the contrary, wave before all who follow or intend to follow that individual's footprints. It should be directed against more than one for an individual is too weak to face this ordeal of embarrassment!

Criticism should not consist in a bellicose attitude towards other's literary efforts. Contentions or war-like attitudes tend to take away the writer from polite or elegant literature.

As a result whatever he would write it would aim at swerving and escaping the blow of critics thus tossing away the gem (which was still to be chiselled and polished) of his literary genius behind the screen of utter oblivion.

It is of paramount importance that criticism should be sifted through the sieve of Reason.

Irrational or sophisticated criticism means merely a nonsensical thing. It does not become us if we stop a person in the street and point out, to his consternation, why he has tucked up his collar, or why he has on a stripped pyjama. But our job is to point out to him the dirt or soot or untidiness of his dress: not to turn up our nose at his thread-bare dress. We can safely say that the grace of his person is eclipsed by the filth over his dress. He would inwardly feel that you wanted to say and perhaps promise to comply with your wish.

Criticism develops with the comparative study of a piece of art. We should pick up two things attempted by a writer, compare and contrast them and then reach certain conclusions.

Criticism should not overtake a writer unawares. Its action should be slow so that its prey might get time to prepare himself to face it. Sudden impression of a thing is not pleasant and healthy.

Mind receives that thing that is presented to it in a good looking and pleasant form. The lethargic cells of mind are excited into active commotion by a mild impact of an outside thing upon it, thus paving the path of a full assimilation of abstruse and constructive knowledge of literature. Sleeping cells of mind should not be titillated with energetic jerks but allowances of time and nicety of treatment should be made. Perhaps it would sound judicial to play a master violinist in this case. He would first dust his violin, shine its wood and strings with a piece of cloth, tighten or loosen them, and then apply his deft fingers upon them. Tunes produced after this much care would be, who is here to deny it, lilting. If a critic, a beginner in particular, takes these pains he can very certainly wait for his recognition in the literary world.

Before exposing a factor of natural weakness of human element to my friends and foes I must crave for their forgiveness. Some opine that passionate people are the best-natured people in the world. But I refuse to accept this.

As Horace Walpole aptly remarks: It is a vulgar notion and worthy of the vulgar to think that passionate people are the best-natured people in the world of Duplicity. Equivocation and pun should, as far as possible, be discarded while touching an abstract subject with a view to criticising it. The target of our criticism should be within the easy reach of our literary comprehension. If we cannot dispense with dwelling upon hazy notions about the piece of writing we are going to criticise, let us do not dally with it, rather leave it for another.

Criticism is an art with brow-furrowing complexities and it is meant for those who have some intrinsic, innate or hard-won propensity to it. It is not a conjurer's trick which we can ape overnight and display it to the people in the morning. It is more onerous and tiresome than a husbandman's tilling the land under the keen heat of the summer sun.

The New Testament *Vs.* The Holy Koran

BY

S. A. M.

The charge of stealth and adaptation from older books levelled against the Holy Koran is mainly due to ignorance and is motivated by growing prejudice against Islam. It is much to be regretted that the line of argument and the way of the evolution of such thoughts closely resemble those of the Jews who condemned Christ as well as his teachings. The Jewish scholars working on similar lines have proved that the Gospels owe their ethical teaching to the Talmud and other Jewish books. Many passages of the Bible have been traced back to their Talmudic origin. Even the Sermon on the Mount which is the pride of the Christian religion, has been taken word for word from the Talmud.

Some Hindus claim that the teachings of Christ are derived from those of the Buddha. The anecdote of "Satan trying Jesus" is current among the Buddhists with obvious alterations. This goes to justify their claim that it was incorporated in the Bible from the Buddhist religion. The advent of Jesus Christ in India is now nearly an established historical fact, which encourages all the more the idea of the Gospel being another version of Buddhism.

It is very amazing that the New-Testament and the Gospel of Jose-Aseph (which was written prior to the birth of Jesus and has now been translated into all the European languages) have almost too much in common. Their passages very closely resemble — are almost true copies, and the self-same parables occur in both. According to some people this book was originally written by Lord Buddha and was later on translated into other languages. This view is shared by some English scholars also. If we accept it, the Gospels lose their worth and Jesus Christ himself becomes a proven thief in the matter of his teachings. We, for ourselves, believe that the book generally ascribed to Jose-Aseph was really written by Jesus Christ during his sojourn in India and therefore we hold it to be the purest of the Bibles. Those Christians who ascribe its authorship to the Buddha smite at their feet.

Christians consider four of their religious books to be holy and the rest of them numbering no less than fifty-six otherwise. Mere guesswork and human discretion are judges for this purge. The Accepted Gospels and the Rejected Ones have a world of difference between

them. It is physically impossible for the human brain alone to establish definitely the authenticity of any and discard others. The clergy of London, thinking this winnowing impossible, presented to King Edward all of these books, real as well as forged, bound as one compendium, at the event of his coronation.

To speak the truth, nobody, with any clarity of conscience, can call any of these books to be genuine. It is due to malice only that those Scriptures which agree more with the Holy Koran are discarded. Accordingly, the Gospel of Brenbas has been rejected due to the only reason that it contained the prophecy about the Prophet of the Later Days. Dr. Sale has related the story how a Christian monk embraced Islam on reading this book.

In short, the test for rejecting a scripture is that it is (1) against the Accepted Bible and (2) up to some extent, in accordance with the Holy Koran. First they call their own religious literature concocted and then they go on to declare that the Holy Koran has adopted their stories.

It is certainly possible for the Word of God to resemble old books because facts remain as such and are not variable. To think that the Koran was based on the then current stories, fables, manuscripts, tablets and the Gospels is due to extreme ignorance. So many facts occurring in the Vedas, which were quite out of the reach of the Arabs of that period are to be found in the Koran The Arabs were absolutely illiterate. Most of the Biblical writings which are only now accessible were unknown to the Arabs of that time. Due to the general illiteracy the few Christians who dwelt in the Peninsula cannot be supposed to have made a profound study of their religion. Therefore the blame that the Holy Koran owes its material to the Bible is altogether erroneous. The Holy Prophet was quite illiterate. He could not even spell out his own language much less Hebrew or Greek.

Had there been any plagiarised portion in the Holy Koran, the Christian Arabs, who were mortal enemies of the rising religion, must have at once raised a hue and cry and the matter had been settled there and then. But the fact is that these allegations are the product of comparatively later times. It must be considered : can a person, who very well knows that he is passing off other people's things as his own, invite all the world against him and nobody accept his challenge? But now there is no use crying over spilt milk. It is in no way believable that the Arabian Christians having in their knowledge such book or books as might be the source of the Holy Koran, no matter authentic or otherwise, could withhold disclosure. All the fuss made later on betrays only the prejudice of these people. The Holy Koran has broken the spell of Christianity, proved baseless the idea of the Divinity of a poor human being and has uprooted the cross. These are the things which have made them sick of the Holy Koran and its Teachings.

If Christians have a God, he is that who died centuries ago in Kashmere. His miracles are in no way superior to those of other prophets. To speak the truth, the

wonders exhibited by the Prophet Elia far outshine his. The Jews even do not accept his having shown any miracle at all. Most of his prophecies never came true. Did his twelve disciples get the twelve thrones according to his promise ? Did Jesus succeed in acquiring an earthly kingdom for which he bought arms and other equipment ? Did Jesus come down from Heaven according to his claim ? Why, he could not even get there. Instead, being freed from the cross he made good his escape by the help of his friends and fled to Kashmere through Afghanistan.

Leaving aside the charge of theft, the New Testament lays all the stress on a single human virtue viz., forgiveness and sets at naught the development of the rest. None of the capacities and talents bestowed on the human beings is useless. Each virtue is justified in its own place and time. As forbearance is a virtue, so is the proper punishment of the culprit when reformation is in view. So neither forgiveness nor vengeance is good at all times. This is what the Holy Koran holds and expounds. Koran tells, "Reward of evil is evil, and he who forgives for the sake of reformation his reward lies with God." On the contrary the Bible enjoins forgiveness in every matter and at all events. This thing paralyses the remaining human faculties on which the edifice of human civilization is based. Christianity allows only one of the many branches of the Human Tree to grow and leaves the others to wither.

It is still more amazing that Christ himself did not act according to this moral code. He himself cursed the fig-tree, finding it without fruit, which taught others to always bless. He forbade others to call anybody a fool while himself went so far in foul talk that he dubbed Jewish scribes as illegitimate children ; furthermore all of his sermons are strewn with bad names for his opponents. A moralist himself should first of all conform to his teachings. Therefore the principles on which even Jesus Christ could not act cannot be Divine.

The holy and all-embracing teachings are those which the Holy Koran brings. It does not lay all the stress on one set of virtues alone. It is equally solicitous about all the diverse branches of the Human Tree. It teaches to forgive when it is suitable and to punish when it is required for the greater purpose of reformation. The Holy Koran presents the faithful picture of those Natural Laws which are clear before our bodily eyes. It is essential that the Word of God be consistent with the Act of God. We find that God does not always show leniency but also metes out various kinds of punishment to the sinners. Only that Code of Law could have been expounded by God as might develop all the faculties of the human soul.

The aim of a Divine Law is to make man emulate all the Divine attributes. This is the utmost that can be expected from him. If somebody wants to nourish in himself some quality in excess of God it is blasphemy.

To forgive on repentance or to hear the prayers of His servants as recommendations is Divine. But

it is plainly insane to think that Tom gets his head pounded with a stone and this act relieves Dick's head-ache. Similarly the Passion and Crucifixion of Jesus cannot be the remedy for the internal maladies of others. No logic can justify that Christ's blood will atone for the sins of another person.

Until Christ did not commit "suicide"—as they call it—Christians were faithful to God. But when they began to believe in Vicarious Atonement this thing threw open the flood gates of sin and iniquity. If it was really a suicide then it must be nothing less than a sin. Had he lived and spent his life in preaching, he would have been much more useful for mankind. This act of Jesus must be useless unless he had again became alive and ascended to heaven before the Jews. In that case it would have been a clear sign for them. But as there was nothing of the sort, the Jews as well as every sensible man consider the ascension of Christ as a fabrication.

The concept of Trinity is still more baffling for the mind. Can one be equal to three? Is it possible that while one is complete God, three different beings again constitute the same Consummate Divinity. Every word of this theory is absurd and self-contradictory. And despite all this darkness Christians believe that God has ceased to send Revelations and we are condemned to judge by our own shallow minds. Their scriptures contain so many silly things that it is quite a job to enumerate all of them. First they deify a poor man and tell us that his crucifixion became an atonement for others' sins and then that he went to Hell. On one side they elevate him to the position of Godhood and on the other they accuse him of imbecility and prevarication They relate that Jesus gave his word to a thief that they would break their fasts that day in Heaven, instead he went to Hell for three days. They tell us that Christ was put to trial by Satan. How strange that Jesus, being God, could not escape from Satan! Had Satan come to Jesus it was an excellent opportunity for him to show him to the Jews. They disbelieved in his prophethood due to the foretelling of a Prophet that Elia must again appear before the advent of Christ. As Elia did not turn up, the Jews took Jesus Christ for a forger and a pretender. Again, being God's son (as they call him) he was ignorant about the Day of Judgment. He could not even know that the fig-tree he was heading for was without any fruit. In short, the Gospels contain much absurdity and much that gives the lie to Jesus Christ.

The real touchstone for a book to be Divine or not is not that it should agree with legends and stories. Only that book can be the Word of God which agrees with His natural laws and whose truth is corroborated by heavenly signs. The signs given to the Holy Prophet of Islam are more than three thousand in number. Moreover, he made innumerable prophecies. We need not fall back on them. One of his greatest miracles is that while the followers of every other Prophet have lost communication with God and therefore their miracles are dead, his followers still receive Divine Revelation and God works miracles for them even now.

POEM

M. ZAFAR MAHMOOD, III Yr

1st April 1959

(This is an English rendering of the late Mr. Himayatullah's Urdu poem published in our last issue—Ed.)

Far from the flickering candle !
Far from the highway of the brilliant lamps
Into the gloomy darkness
Without a ray of light
Without a cheering sight
From the burning lips and the afflicted bosom
Sometimes doth rise thy name
Like the flapping of an angel's soft wings
Like the stamping out of memories
Of bitter complaints.
In thy name is the soft footfall
Of a cool breeze of morn of a new dawn
Addressing a rose
Kissing a tender bud
With thy name
In the caravan of memories
Is the joyous tinkle
Of shining little bells
A little afflicted desire
Melting away into tears
This crying night !
This profound silence
As if a host of demons fierce
Have come from the garden of sin
Torule the world
To night
The heavy spirits from the Temple of Death
Drunk on the warm and crimson blood
In nameless graves
Do cry !
Then crying and crying sink into silence.
Amidst this storm of passion and madness
Shines and drifts thy name

Like a lamp
Brightening the dark night
Cheering the sad soul with its milky light
What a poor miserable
Kind of life it would be
Amidst this swirling smoke of despair
What a night would it be
Without this lamp
Without this name
In this blind confusion
In this wilderness vast
Where there is no sign of dawn
No trace of life.
How many thoughts !
How many beliefs !
Who knows ?
Vainly would have died
For a ray of light.
And I wonder
In this wonder
In this storm of inky darkness
How many would reach
The destination, the goal
My journey needs not the light of a lamp.
It hath the self wakefulness
If not a burning desire
For thy name.
At least it hath its sympathies.

Wordsworth and Nature

BY

SALEEM A. SIDDIQUE, III Year

Human endeavour has always been struggling to overcome the natural ambiguities and ceaseless vicissitudes of mortal life. The modern civilization which claims to be at its zenith is suffering from some kind of ocular illusion. Man has gone astray into the dark, unknown and self-created deception of his own. To live is an art which is neither to be achieved by effort of thinking, nor explained by the accuracy of speaking. It is an instinct which can only be developed through the minds of successive generations.

There are different and divergent views about life. Some people say: Birth is a mystery and death is a riddle and in between the two lies the tableland of life. Man has woven the golden web of life with the silver fibres of thoughts. But human peace seems to be perturbed by the mere thought of death :

"Death like an over flowing stream
sweeps us away ; our life's a dream."

In the pitch darkness of obscurity of thoughts and in such a state of human life we can still see a ray of light and happiness. That happy world whose happy memory acts as a balm which soothes and comforts the wounds and ruptures caused by human sufferings.

Wordsworth takes the reader away to that world—the world of nature where the evergreen pastures of joy and celestial air of cheerfulness make the gloomy faces happy and obscure minds enlivened. He knows his path to happiness and therefore the troubles of our daily mundane life do not seem to disturb his peace of mind. He knew how to live happily though his life was full of troubles and miseries. Until he was thirty, it is said, Wordsworth had earned only £10/-. But even then he called himself the happiest man :

"No one has completely understood me—not even Coleridge. He is not happy enough. I am myself one of the happiest of men, and no man who lives a life of constant bustle and whose happiness depends on the opinions of others can possibly comprehend the best of my poems."

We have to make an intimate study of the secret which is concealed in his mind and even Coleridge is unable to understand it. His life was full of miseries and troubles and he suffered both poverty and unhappy passions. He was a man intoxicated, not with wine, but with brook.water. It shall be beneficial if I quote Mr. F. L. Lucas in this connection ;

"What, then, was Wordsworth's secret? He was born with no silver spoon in his mouth. In youth he suffered both poverty and unhappy passion ; nor was his happy-go-lucky temper of Leigh Hunt—he felt too violently." 'Had I been a writer of love-poetry, it would have been natural to me to write it with a degree of a warmth which could hardly have been approved of by my principles, and which might have been undesirable for the reader.'

Whenever he is tired of unhappy thoughts which shroud his mind he seems to take refuge in the green meadows of nature. The enchanting voice of chirping birds which is full of immortal evergreen spirit of heavenly song vibrates in his ears. In his old age, the treasure of happiness which he had collected and accumulated in the store-house of his memories makes him more cheerful and that happy memory serves as a food in his old age. In this connection he says :

'While here I stand, not only with the sense of present pleasure, but with pleasing thoughts that in this moment there is a life and food for future years.'

He says that in youth he enjoyed the bounteous charm of nature very pleasantly, but now when the vigour and vitality of youth have been translated into the wrinkles of old age, he does not feel sorry. He says that he has sufficiently collected treasure for the weaker period of age—the treasure which nature has bestowed upon him. He says :

Not for this
Faint I, nor mourn nor murmur ; other gifts
Have followed ; for such loss, I would believe,
Abundant recompense. For I have learned
To look on nature, not as in the hour of thoughtless youth ;
but hearing often times
The still sad music of humanity,
Nor harsh nor grating, though of ample power
To chasten and subdue.

The above lines express in a very beautiful, cheerful and elucidating manner the change which the poet has undergone He says that he does not ponder at all over the loss he has undergone because nature has taught him to listen to the still and sad music of humanity. In his prime of youth he could not speculate in such a fashion as now he can. He is mirthful for he can hear the sad rhyme of humanity through the gates of his ears and can see the natural beauty of green pastures and meadows. He loves nature for it never does betray the heart that loves her.

Another aspect of human life for which he is very sorry is that the world is too much with us. He is of the idea that the love of mortal beings is temporary in itself. Aesthetic values are poisoned in the stinking atmosphere of the world. He says that we should collect that treasure which is apparelled in celestial light. He reminds humanity of the life before birth ; when man is born his mind is free from all kinds of prides and prejudices but with the passage of time the heavenly light which the child brings from the eternal palace of peace and love fades away. He says :

Shades of prison-house begin to
close upon the growing boy,
But he beholds the light, and
whence it flows,
He sees it in his joy ;
The youth who daily farther from
the east
Must travel, still is Nature's
Priest
And by the vision splendid
Is on his way attended ;
At length Man perceives it die
away,
And fade into the light of
common day.

To conclude, Wordsworth's pantheism, i e., worship of nature, is the struggle and battle of the mind fought against the human suffering and misery and finally he takes asylum in the loving cradle of nature.

Some Mathematical Tricks

BY
ABDUR RAHMAN NASIR, B.Sc. Final

There was a time when Mathematics was regarded as a subject that could offer no pleasure to its readers. They considered it too dry a subject to be learnt by them. Although it is not child's play to get pleasure out of Mathematics yet he who seeks it, finds it to some extent in this subject as well.

When a Mathematician, at the expense of time and energy, solves a problem—a problem whose result was unknown to him—his joy knows no bounds, because there he finds some proportion between the labour and its reward.

For the amusement of the readers there are some Mathematical tricks given below. Try these tricks with your friends.

The procedure given is a general one and can be applied to the directions given.

1. Ask your friend,
   (*i*) To choose a certain number (n) Let n=13
   (*ii*) To multiply this number by 2 $13 \times 2 = 26$
   (*iii*) Then to this add 18 $26 + 18 = 44$
   (*iv*) Multiply the sum by 2 $44 \times 2 = 88$
   (*v*) Then subtract from this 36 $88 - 36 = 52$

Then ask him to announce his result so obtained. And dividing this number by 4 tell him the number choosen by him, *i.e.*,

$52/4 = 13$

——

2. Ask your friend
   (*i*) To choose a certain number (n) say (n)=9
   (*ii*) To multiply this number by 2 $9 \times 2 = 18$
   (*iii*) To add 4 to it $18 + 4 = 22$
   (*iv*) To divide the sum by 2 $22 \div 2 = 11$
   (*v*) To add 7 to the quotient $11 + 7 = 18$
   (*vi*) To multiply the sum by 8 $18 \times 8 = 144$
   (*vii*) To subtract 12 from the product $144 - 12 = 132$
   (*viii*) To divide the remainder by 4 $132 \div 4 = 33$
   (*ix*) To subtract 11 from the quotient $33 - 11 = 22$

Then ask him to announce this last number. From this subtracting 4 and then dividing by 2 afterwards, tell him the number chosen by him *i.e.* $(22-4) \div 2 = 9$

——

3. How to guess the age of a person :—

Let the age of your friend be 23 years and he was born on 26th April. You do not know about his age and date of birth. Merely asking him to follow your instructions and to perform certain operations you can know his age and date.

Ask him to

(*i*) Multiply the number of month of birth by 100 $4 \times 100 = 400$

(*ii*) Add date of birth to this product $400 + 26 = 426$

(*iii*) Multiply this by 2 $426 \times 2 = 852$

(*iv*) Add 8 to this product $852 + 8 = 860$

(*v*) Multiply the sum by 5 $860 \times 5 = 4300$

(*vi*) Add 4 to the product $4300 + 4 = 4304$

(*vii*) Multiply the sum by 10 $4304 \times 10 = 43040$

(*viii*) Add 4 to the product $43040 + 4 = 43044$

(*ix*) Add to the sum the age and announce the result $43044 + 23 = 43067$

From this number subtract 444 yourself and then make the pairs starting from the right. The pair on the right hand side will give you his age ; the next pair his date of birth and the last pair (or digit on the left hand side) will give you the month in which he was born.

as $43067 - 444 : 42623$

4, 26, 23 : Month ; date ; age.

"Mr. MALAPROP"

BY

ABAB, III Yr.

The character which I am presenting before the readers is not the same character with which some of them become familiar when they read some of Dickens' novels. This character is an interesting one.

I knew Mr. Malaprop even before I met him in his physical form. At that moment I imagined him to be a perfect and a civilized man, but now my conception about him has greatly changed, illusions dashed to the ground. Formerly I held him in high esteem and my heart was filled with a glowing and ever-glowing honour for him.

Little knowledge is a dangerous thing, especially where the personality of such a person is concerned. I think every idea should be verified, before it is put into print. My honourable friend Mr. Malaprop mostly, if not always, uses "English accented" words in his writings and conversation. Many a time, I consulted different kinds of dictionaries, but all my hopes of increasing my word-power melted away as dew at the approach of a summer's morning. Perhaps he wanted and wants to exhibit his greatness and personality by displaying these "English Accented' words among his fellow students.

I admire his courage. Mr. Malaprop is either increasing the number of words in the English dictionary or is thinking to be living in a world where all the people are illiterate.

Mr. Malaprop whiles his time away in criticising others. He criticises his teachers, professors who arm him with knowledge. I know my honourable friend Mr. Malaprop will not appreciate my thunder-bolting remarks, but this is a crystal clear fact that had Mr. Malaprop not criticised others he would not have been criticised.

Mr. Malaprop thinks himself to be the only learned man. He thinks himself to be superior to others whatever class or occupation they may belong to, resulting in dislike and disgust. Every student in the college, with the exception of those who are like him, passes remarks of disgust and insolence. Then obviously I deduce that Mr. Malaprop is the master of Mrs Gamp, well known for her filthy habits.

I, with a clean heart and unbiased mind, advise the reader to pay a visit to Mr. Malaprop, this outstanding character, so that he may judge him from his personal point of view.

Oh Malaprop ! You should be humble, your pride has curtailed your person.

In contempt, you are humbled
No place can contain your person.
Flee ! Flee ! or be humble.

THE SACRED WINE

BY

L. RAHMAN [redacted], III Yr.

1. Love is such a desirable sin
Which can't be committed by every man
Countless men dwell in the mortal inn
But flame isn't found in every pan.

2. Love is a bottomless sea of zeal
Where glide the skiffs of passions
'Tis not something corporeal
It is free from skips of fashions !

3. Love is a charming balmy bloom
Among flowers in the garden of mankind
Or like that beautiful gleamy moon
Whose cool light is peace for the mind.

4. Love is a sanative fragrant ointment
For the torrid wounds of mind
Cupid taught me against disappointment
The unknown goal was shown by a "blind".

5. Love is that sweet melliferous wine
Which is put in the goblet of humanity
By the mighty Power known as Divine
For the sure evidence of Divinity.

6. Love for a fairy is a venereal desire
I loudly call it a sexual wish
But friends ! love for "Love" is a real fire
Which effaces an actual blemish.

OLD FAMILIAR FACES

BY

IJAZURREHMAN

The memory of old friends, old places, old songs is dear to every one. I always remember places by association with the songs I used to hum there. Even the day when I first stepped into the college can be recalled by me simply by whistling the tune I was practising on my way there. I think similar must be the case with many of us who are gifted with a sense of music. This is indeed a psychological effect and in general any act performed long ago, if performed afterwards, will at once remind the subject of the time and place when and where he last did it. A similar trick was played upon Fnanklin, the hero of *The Moonstone* in order to search his memory and learn the whereabouts of the stolen diamond. Here it was an unusual dose of laudanum administered by careful hands that solved the problem. The property of snatches of old tunes in recalling to mind places frequented in the past is thus established. And the converse of it is also true.

In 1954 our college was shifted to Rabwah during the summer vacation. Many students who belonged to Lahore had to migrate to the local institutions. Consequently our classes were thinned and many of us had to part with former classfellows and in some cases dear friends. A certain gentleman who had endeared himself to me in the course of a year by virtue of his diverse avocations which happened to coincide with mine left the college and went away from us for ever. The affinity between us had resulted in our occupying the same room in the hostel. Soon afterwards I had a chance of paying a visit to the old building in the metropolis now inhabited by more than one institution. Our former abode in the hostel was my destination. My entrance into the old premises stirred all sorts of memories. As I passed by the Principal's office I remembered myself standing outside the door in a long queue, application in hand, waiting for admittance. The sight of the lecture room next reminded me of the new acquaintances I had formed on rejoining the college in III Year, who used to sit shoulder to shoulder with me. Next came the Physics theatre where I had attended the largest number of lectures in the first two years of my college life and was therefore the dearest to me. In fact I felt a strong urge to go in and

sit there and would fain have studied the lessons already read and committed to memory. Our dormitory was above a flight of stairs and was found locked by the new occupants who were out attending their classes. Through a wide circular hole in the door at nearly my height I was able to penetrate my eager looks, without causing the least distortion in my body (and arousing the least suspicion), on the floor and walls of the room where I had passed the happiest of my days in the company of that chum. The next object of my gaze was an inscription by my friend on a paper in bold handwriting. The paper had been put in place of a missing window pane, and the writing being inside had baffled the fury of the rains. It was his own name and perhaps the name of the new occupant too who had tolerated its existence.

The sight of his name so written was meeting enough, and I could clearly imagine him bent serenely with his round face over the paper when he was busy in its caligraphy.